رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۰۳

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے ۔ لو تمہیں طورِ تسلّی کا بتایا ہم نے

ریویو آف ریلیجنز

یعنی

دُنیا کے مذاہب پر نظر

جلد ۲ بابت ماہ جون ۱۹۰۳ء نمبر ۶

فہرست مضامین

انجمن اشاعتِ اسلام قادیان دارالامان نے
انوار احمدیہ پریس قادیان میں باہتمام شیخ یعقوب علی تراب احمدی چھپوا کر
۲۰ جون ۱۹۰۳ء کو شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

معرفت الٰہی کے ذرائع

اس سوال کے جواب میں واضح ہو کہ اس بارے میں جس قدر قرآن شریف نے مبسوط طور پر ذکر فرمایا ہے اُسکے ذکر کرنے کی تو اس جگہ کسی طرح گنجائش نہیں لیکن بطور نمونہ کسی قدر بیان کیا جاتا ہے سو جاننا چاہئے کہ قرآن شریف نے علم تین قسم پر قرار دیا ہے۔ علم الیقین۔ عین الیقین۔ حق الیقین۔ جیسا کہ ہم پہلے اِس سے سورہ الہٰکم التکاثر کی تفسیر میں ذکر کر چکے ہیں اور بیان کر چکے ہیں کہ علم الیقین وُہ ہے کہ شے مقصود کا کسی واسطہ کے ذریعہ سے نہ بلا واسطہ پتہ لگایا جائے جیسا کہ ہم دھوئیں سے آگ کے وجود پر استدلال کرتے ہیں۔ ہم نے آگ کو دیکھا نہیں مگر دھوئیں کو دیکھا ہے کہ جس سے ہمیں آگ کے وجود یقین آیا۔ سو یہ علم الیقین ہے اور اگر ہمنے آگ کو ہی دیکھ لیا ہے تو یہ بموجب بیان قرآن شریف یعنے سورہ الہٰکم التکاثر کے علم کے مراتب میں سے عین الیقین کے نام سے موسوم ہے اور اگر ہم اُس آگ میں داخل بھی ہو گئے ہیں تو اس علم کے مرتبہ کا نام قرآن شریف کے بیان کی رُو سے حق الیقین ہے۔ سورۃ الہٰکم التکاثر کے اب دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں ناظرین اُس موقع سے اس تفسیر کو دیکھ لیں۔ اب جاننا چاہئے کہ پہلی قسم کا جو علم ہے یعنے علم الیقین اس کا ذریعہ عقل اور منقولات ہیں اللہ تعالےٰ دوزخیوں سے حکایت کر کے فرماتا ہے قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ یعنے دوزخی کہیں گے کہ اگر ہم عقلمند ہوتے اور مذہب اور عقیدہ کو معقول طریقوں سے آزماتے۔ یا کامل عقلمندوں اور محققوں کی تحریروں اور تقریروں کو توجہ سے سُنتے تو آج دوزخ میں نہ پڑتے۔ یہ آیت اس دُوسری آیت کے موافق ہے جہاں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنے خدا تعالےٰ انسانی نفوس کو انکی وسعت علمی سے زیادہ کسی بات کو قبول کرنے کے لئے تکلیف نہیں دیتا اور وہی عقیدے پیش کرتا ہے جنکا سمجھنا

اِنسان کے حد استعداد میں داخل ہے تا اُسکے حکم تکلیف مالایُطاق میں داخل نہ ہوں اور ان آیات میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اِنسان کانوں کے ذریعہ سے بھی علم الیقین حاصل کر سکتا ہے۔ مثلاً ہمنے لندن تو نہیں دیکھا صرف دیکھنے والوں سے اِس شہر کا وجود سُنا ہے مگر کیا ہم شک کر سکتے ہیں کہ شائد ان سب نے جھوٹ بول دیا ہوگا یا مثلاً ہمنے عالمگیر کا زمانہ نہیں پایا اور نہ عالمگیر کی شکل دیکھی ہے مگر کیا ہمیں اِس بات میں کچھ بھی شُبہ ہے کہ عالمگیر چغتائی بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا۔ پس ایسا یقین کیوں حاصل ہُوا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ صرف سماع کے تواتر سے۔ پس اس میں کچھ شک نہیں کہ سماع بھی علم الیقین کے مرتبہ تک پُہنچاتا ہے۔ نبیوں کی کتابیں اگر سلسلہ سماع میں کچھ خلل نہ رکھتی ہوں وُہ بھی ایک سماعی علم کا ذریعہ ہیں لیکن اگر ایک کتاب آسمانی کتاب کہلا کر پھر مثلاً پچاس ساٹھ نسخہ اسکے پائے جائیں اور بعض بعض کے مخالف ہوں تو گو کسی فریق نے یقین بھی کر لیا ہو کہ ان میں سے صرف دو چار صحیح ہیں اور باقی جعلی اور وضعی لیکن محقق کے لئے ایسا یقین جو کسی کامل تحقیقات پر مبنی نہیں بیہودہ ہوگا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ سب کتابیں اپنے تناقض کی وجہ سے ردی اور ناقابل اعتبار قرار دیجائینگی اور ہرگز جائز نہیں ہوگا کہ ایسے متناقض بیانات کو کسی علم کا ذریعہ ٹھیرایا جائے کیونکہ علم کی یہ تعریف ہے کہ ایک یقینی معرفت عطا کرے اور مجموعہ متناقضات میں یقینی معرفت کا پایا جانا ممکن نہیں۔ اس جگہ یاد رہے کہ قرآن شریف صرف سماع کی حد تک محدُود نہیں ہے کیونکہ اِس میں اِنسانوں کے سمجھانے کے لئے بڑے بڑے معقُول دلائل ہیں۔ اور جس قدر عقائد اور اصُول اور احکام اُس نے پیش کئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا امر نہیں جس میں زبردستی اور تحکّم ہو۔ جیسا کہ اس نے خُود فرما دیا ہے کہ یہ سب عقائد وغیرہ اِنسان کی فطرت میں پہلے سے منقوش ہیں اور قرآن شریف کا نام ذکر رکھا ہے جیسا کہ فرماتا ہے هٰذا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ یعنے یہ قرآن بابرکت کوئی نئی چیز نہیں لایا بلکہ جو کچھ اِنسان کی فطرت اور صحیفۂ قدرت میں بھرا پڑا ہے اس کو یاد دلاتا ہے اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنے یہ دین کوئی بات جبر سے منوانا نہیں چاہتا بلکہ ہر ایک بات کے دلائل پیش کرتا ہے ماسوا اس کے قرآن میں دلوں کو روشن کرنے کے لئے ایک رُوحانی خاصیت بھی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ یعنے قرآن اپنی خاصیت سے تمام بیماریوں کو دُور کرتا ہے۔ اِس لئے اس کو منقُولی کتاب نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ اعلےٰ درجہ کے معقُول دلائل اپنے ساتھ رکھتا ہے اور ایک چمکتا ہُوا نُور اسمیں پایا جاتا ہے ایسا ہی عقلی دلائل جو صحیح مقدمات سے مستنبط ہوئے ہوں بلا شُبہ علم الیقین تک

پہنچاتے ہیں۔ اسی کی طرف اللہ جلشانہٗ آیات مندرجہ ذیل میں اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ وہ کہتا ہے
اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۙ الَّذِیْنَ
یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا
مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ یعنے جب دانشمند اور اہل عقل انسان
زمین اور آسمان کے اجرام کی بناوٹ میں غور کرتے اور رات دن کی کمی بیشی کے موجبات اور علل کو
نظر عمیق سے دیکھتے ہیں اُنہیں اس نظام پر نظر ڈالنے سے خدا تعالیٰ کے وجود پر دلیل ملتی ہے پس وہ
زیادہ انکشاف کے لئے خدا سے مدد چاہتے ہیں اور اُس کو کھڑے ہو کر اور بیٹھکر اور کروٹ پر لیٹ کر
یاد کرتے ہیں جس سے اُن کی عقلیں بہت صاف ہو جاتی ہیں۔ پس جب وہ ان عقلوں کے ذریعہ سے اجرام
فلکی اور زمین کی بناوٹ احسن اور اولیٰ میں فکر کرتے ہیں تو بے اختیار بول اُٹھتے ہیں کہ ایسا نظام ابلغ اور محکم
ہرگز باطل اور بے سود نہیں بلکہ صانع حقیقی کا چہرہ دکھلا رہا ہے پس وہ الوہیت صانع عالم کا اقرار کرکے یہ مناجات
کرتے ہیں کہ یا الٰہی تو اس سے پاک ہے کہ کوئی تیرے وجود سے انکار کرکے نالائق صفتوں سے تجھے موصوف
کرے سو تو ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا یعنی تجھ سے انکار کرنا عین دوزخ ہے اور تمام آرام اور راحت تجھ میں اور تیری شناخت
میں ہے جو شخص کہ تیری سچی شناخت سے محروم ہا وہ درحقیقت اسی دنیا میں آگ میں ہے۔

ایسا ہی ایک علم کا ذریعہ انسانی کانشنس بھی ہے جس کا نام خدا کی کتاب میں انسانی فطرت رکھا
ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا یعنے خدا کی فطرت جس پر لوگ
پیدا کئے گئے ہیں۔ اور وہ نقش فطرت کیا ہے یہی کہ خدا کو واحد لاشریک خالق الکل مرنے اور پیدا ہونے
سے پاک سمجھنا اور ہم کانشنس کو علم الیقین کے مرتبہ پر اس لئے کہتے ہیں کہ گو بظاہر اس میں ایک
علم سے دوسرے علم کی طرف انتقال نہیں پایا جاتا جیسا کہ دھوئیں کے علم سے آگ کے علم کی طرف انتقال
پایا جاتا ہے لیکن ایک قسم کے باریک انتقال سے یہ مرتبہ خالی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر ایک چیز میں
خدا نے ایک نامعلوم خصوصیت رکھی ہے جو بیان اور تقریر میں نہیں آسکتی لیکن اُس چیز پر نظر ڈالنے اور اُس کا تصور
کرنیسے بلا توقف اس خاصیت کیطرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے غرض وہ خاصیت اس وجود کو ایسی لازم پڑی
ہوتی ہے جیسا کہ آگ کو دھواں لازم ہے مثلاً جب ہم خدا تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ کیسی
ہونی چاہئے۔ آیا خدا ایسا ہونا چاہئے کہ ہماری طرح پیدا ہو اور ہماری طرح دکھ اُٹھاوے اور ہماری طرح

مرے تو معاً اس تصور سے ہمارا دل دُکھتا اور کانشنس کانپتا ہے اور اس قدر جوش دکھلاتا ہے کہ گویا اس خیال کو دھکے دیتا ہے اور بول اُٹھتا ہے کہ وہ خدا جس کی طاقتوں پر تمام اُمیدوں کا مدار ہے وہ تمام نقصانوں سے پاک اور کامل اور قوی چاہیئے۔ اور جب ہی کہ خدا کا خیال ہمارے دل میں آتا ہے معاً توحید اور خدا میں دُھوئیں اور آگ کیطرح بلکہ اس سے بہت زیادہ ملازمت تامہ کا احساس ہوتا ہے۔ لہٰذا جو علم ہمیں ہمارے کانشنس کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے وُہ علم الیقین کے مرتبہ میں داخل ہے۔ لیکن اس پر ایک اَور مرتبہ ہے جو عین الیقین کہلاتا ہے اور اس مرتبہ سے اس طور کا علم مُراد ہے کہ جب ہمارے یقین اور اُس چیز میں جس کی نوع کا یقین کیا گیا ہے کوئی درمیانی واسطہ نہ ہو۔ مثلاً جب ہم قوّتِ شامہ کے ذریعہ سے ایک خوشبو یا بدبو کو معلوم کرتے ہیں اور یا ہم قوّتِ ذائقہ کے ذریعہ سے شیریں یا نمکین پر اطلاع پاتے ہیں یا قوّتِ حاسہ کے ذریعہ سے گرم یا سرد کو معلوم کرتے ہیں تو یہ تمام معلومات عین الیقین کی قسم میں داخل ہیں مگر عالم ثانی کے بارے میں ہمارا علم الٰہیات تب عین الیقین کی حد تک پہنچتا ہے کہ جب خود بلا واسطہ ہم الہام پاویں خدا کی آواز کو اپنے کانوں سے سُنیں اور خدا کے صاف اور صحیح کشفوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں ہم ہمیشہ کامل معرفت کے حاصل کرنے کے لئے بلا واسطہ الہام کے محتاج ہیں اور اس کامل معرفت کی ہم اپنے دل میں بھوک اور پیاس بھی پاتے ہیں اگر خدا تعالیٰ نے ہمارے لئے پہلے سے اس معرفت کا سامان مُہیا نہیں کیا تو یہ پیاس اور بھوک ہمیں کیوں لگا دی ہے۔ کیا ہم اس زندگی میں جو ہمارے آخرت کے ذخیرہ کے لئے یہی ایک پیمانہ ہے اس بات پر راضی ہو سکتے ہیں کہ ہم اُس سچے اور کامل اور قادر اور زندہ خدا پر صرف قصّوں اور کہانیوں کے رنگ میں ایمان لاویں یا محض عقلی معرفت پر کفایت کریں جو اب تک ناقص اور ناتمام معرفت ہے کیا خدا کے سچے عاشقوں اور حقیقی دلدادوں کا دل نہیں چاہتا کہ اس محبوب کے کلام سے لذّت حاصل کریں۔ کیا جنہوں نے خدا کے لئے تمام دُنیا کو برباد کیا۔ دل کو دیا جان کو دیا وہ اس بات پر راضی ہو سکتے ہیں کہ صرف ایک دُھندلی سی روشنی میں کھڑے مرتے رہیں۔ اور اُس آفتابِ صداقت کا مُنہ نہ دیکھیں کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اُس زندہ خدا کا اَنَا المَوجُود کہنا وُہ معرفت کا مرتبہ عطا کرتا ہے کہ اگر دُنیا کے تمام فلاسفروں کی خود تراشیدہ کتابیں ایک طرف رکھیں اور ایک طرف انا الموجود خدا کا کہنا تو اسکے مُقابل وہ تمام دفتر ہیچ ہیں جو فلاسفر کہلا کر آپ اندھے رہے وہ ہمیں کیا سکھائیں گے۔ غرض اگر خدا تعالےٰ نے حق کے طالبوں کو کامل معرفت دینے کا ارادہ فرمایا ہے تو ضرور اُس نے اپنے مکالمہ اور مخاطبہ کا طریق

کھلا رکھا ہے۔ اِس بارے میں اللہ جلّشانہٗ قرآن شریف میں یہ فرماتا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ یعنے اے خدا ہمیں وہ استقامت کی راہ بتلا جو راہ اُن لوگوں کی ہے جن پر تیرا انعام ہوا ہے۔ اِس جگہ انعام سے مُراد الہام اور کشف وغیرہ آسمانی علوم ہیں جو انسان کو براہِ راست ملتے ہیں ایسا ہی ایک دُوسری جگہ فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ یعنی جو لوگ خدا پر ایمان لاکر پُوری پُوری استقامت اختیار کرتے ہیں اُن پر خدا تعالےٰ کے فرشتے اُترتے ہیں اور یہ الہام اُن کو کرتے ہیں کہ تم کچھ خوف اور غم مت کرو تمہارے لئے وہ بہشت ہے جس کے بارے میں تمہیں وعدہ دیا گیا ہے سو اس آیت میں بھی صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ خدا تعالےٰ کے نیک بندے غم اور خوف کے وقت خدا سے الہام پاتے ہیں اور فرشتے اُتر کر انکی تسلی کرتے ہیں اور پھر ایک اور آیت میں فرمایا ہے لَہُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ یعنے خدا کے دوستوں کو الہام اور خدا کے مکالمہ کے ذریعہ سے اِس دُنیا میں خوشخبری ملتی ہے اور آئندہ زندگی میں بھی ملیگی۔ لیکن اس جگہ یاد رہے کہ الہام کے لفظ سے اِس جگہ یہ مُراد نہیں ہے کہ سوچ اور فکر کی کوئی بات دل میں پڑ جائے جیسا کہ جب شاعر شعر کے بنانے میں کوشش کرتا ہے ایک مصرع بنا کر دُوسرا سوچتا رہتا ہے تو دُوسرا مصرع دل میں پڑ جاتا ہے سو یہ دل میں پڑ جانا الہام نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے قانون قدرت کے مُوافق اپنے فکر اور سوچ کا ایک نتیجہ ہے۔ جو شخص اچھی باتیں سوچتا ہے یا بُری باتوں کیلئے فکر کرتا ہے اُس کی تلاش کے موافق کوئی بات ضرور اس کے دل میں پڑ جاتی ہے۔ ایک شخص مثلاً نیک اور راستباز آدمی ہے جو سچائی کی حمایت میں چند شعر بناتا ہے اور دُوسرا شخص جو ایک گندہ اور پلید آدمی ہے اپنے شعروں میں جھوٹ کی حمایت کرتا ہے اور راستبازوں کو گالیاں نکالتا ہے تو بلاشبہ یہ دونوں کچھ نہ کچھ شعر بنالیں گے۔ بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ وہ راستبازوں کا دُشمن جو جھوٹ کی حمایت کرتا ہے بباعث دائمی مشق کے اسکا شعر عمدہ ہو۔ سو اگر صرف دل میں پڑ جانیکا نام الہام ہے تو پھر ایک بدمعاش شاعر جو راستبازی اور راستبازوں کا دشمن اور ہمیشہ حق کی مخالفت کے لئے قلم اُٹھاتا اور افتراؤں سے کام لیتا ہے خدا کا ملہم کہلائیگا دُنیا میں ناولوں وغیرہ میں جادو بیانیاں پائی جاتی ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ اِس طرح سراسر باطل مگر مسلسل مضمون لوگوں کے دلوں میں پڑتے ہیں۔ پس کیا ہم ان کو الہام کہہ سکتے ہیں بلکہ اگر الہام صرف دل میں بعض باتیں پڑنیکا نام ہے تو ایک چور بھی مُلہم کہلا سکتا ہے کیونکہ وُہ بسا اوقات فکر کرکے اچھے اچھے طریق نقب زنی کے نکال لیتا ہے اور عُمدہ عمدہ تدبیریں ڈاکہ مارنے اور خُون

ناحق کرنے کی اس کے دل میں گنجائش رہ جاتی ہیں تو کیا لائق ہے کہ ہم ان تمام ناپاک طریقوں کا نام الہام رکھدیں ہرگز نہیں بلکہ یہ اُن لوگوں کا خیال ہے جنکو اب تک اُس سچے خدا کی خبر نہیں جو آپ خاص مکالمہ سے دلوں کو تسلی دیتا اور ناواقفوں کو رُوحانی علوم سے معرفت بخشتا ہے۔ الہام کیا چیز ہے وہ پاک اور قادر خدا کا ایک برگزیدہ بندہ کے ساتھ یا اُسکے ساتھ جسکو برگزیدہ کرنا چاہتا ہے ایک زندہ اور باقدرت کلام کے ساتھ **مکالمہ** اور **مخاطبہ** ہے۔ سو جب یہ مکالمہ اور مخاطبہ کافی اور تسلی بخش سلسلہ کے ساتھ شروع ہو جائے اور اس میں خیالات فاسدہ کی تاریکی نہ ہو اور غیر مکتفی اور چند بے سروپا لفظ ہوں اور کلام لذیذ اور پُرحکمت اور پُرشوکت ہو تو وہ خدا کا کلام ہے جس سے وہ اپنے بندے کو تسلی دینا چاہتا ہے اور اپنے تئیں اُسپر ظاہر کرتا ہے۔ ہاں کبھی ایک کلام محض امتحان کے طور پر ہوتا ہے اور پورا اور بابرکت سامان ساتھ نہیں رکھتا اس میں خدا تعالیٰ کے بندہ کو اسکی ابتدائی حالت میں آزمایا جاتا ہے تا وہ ایک ذرہ الہام کا مزہ چکھ کر پھر واقعی طور پر اپنا حال و قال سچے ملہموں کی طرح بناوے یا ٹھوکر کھاوے۔ پس اگر وہ حقیقی راستبازی صدیقوں کی طرح اختیار نہیں کرتا تو اس نعمت کے کمال سے محروم رہ جاتا ہے اور صرف بیہودہ لاف زنی اسکے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کروڑہا نیک بندوں کو الہام ہوتا رہا ہے مگر انکا مرتبہ خدا کے نزدیک ایک درجہ کا نہیں بلکہ خدا کے پاک نبی جو پہلے درجہ پر کمال صفائی سے خدا کا الہام پانیوالے ہیں وہ بھی مرتبہ میں برابر نہیں خدا تعالیٰ فرماتا ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یعنی بعض نبیوں کو بعض نبیوں پر فضیلت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ الہام محض فضل ہے اور فضیلت کے وجود میں اُسکو دخل نہیں بلکہ فضیلت اس صدق اور اخلاص اور وفاداری کے قدر پر ہے۔ جس کو خدا جانتا ہے ہاں الہام بھی اگر اپنی بابرکت شرائط کے ساتھ ہو تو وہ بھی ان کا ایک پھل ہے اسمیں کچھ شک نہیں کہ اگر اس رنگ میں الہام ہو کہ بندہ سوال کرتا ہے اور خدا اُس کا جواب دیتا ہے اسی طرح ایک ترتیب کے ساتھ سوال و جواب ہو اور الٰہی شوکت اور نُور الہام میں پایا جاوے اور علوم غیب یا معارف صحیحہ پر مشتمل ہو تو وہ خدا کا الہام ہے خدا کے الہام میں یہ ضروری ہے کہ جس طرح ایک دوست دوسرے دوست سے ملکر باہم ہمکلام ہوتا ہے اسی طرح رب اور اُس کے بندہ میں ہمکلامی واقع ہو اور جب یہ کسی امر میں سوال کرے تو اس کے جواب میں ایک کلام لذیذ فصیح خدا تعالےٰ کی طرف سے سُنے جس میں اپنے نفس اور فکر اور غور کا کچھ بھی دخل نہ ہو اور وہ مکالمہ اور مخاطبہ اُسکے لئے موہبت ہو جائے تو وہ خدا کا کلام ہے اور ایسا بندہ خدا کی جناب میں عزیز ہے مگر یہ درجہ کہ الہام بطور موہبت ہو اور زندہ اور پاک الہام کا سلسلہ

ایسے بندہ کو خدا سے حاصل ہوا و صفائی اور پاکیزگی کے ساتھ ہو کسی کو نہیں ملتا بجز اُن لوگوں کے
جو ایمان اور اخلاص اور اعمال صالح میں ترقی کریں اور نیز اُس چیز میں جسکو ہم بیان نہیں کر سکتے سچا اور
پاک الہام الوہیت کے بڑے بڑے کرشمے دکھلاتا ہے بارہا ایک نہایت چمکدار نور پیدا ہوتا ہے اور
ساتھ اسکے پُر شوکت اور چمکدار الہام آتا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ملہم اس ذات سے باتیں کرتا ہے
جو زمین و آسمان کا پیدا کرنیوالا ہے۔ دُنیا میں خدا کا دیدار یہی ہے کہ خدا سے باتیں کرے مگر اس ہمارے بیان
میں انسان کی وہ حالت داخل نہیں ہے جو کسی کی زبان پر بے ٹھکانہ کوئی لفظ یا فقرہ یا شعر جاری ہو اور
ساتھ اس کے کوئی مکالمہ اور مخاطبہ ہو بلکہ ایسا شخص خدا کے امتحان میں گرفتار ہے کیونکہ خدا اس طریق سے
بھی سست اور غافل بندوں کو آزماتا ہے کہ کبھی کوئی فقرہ یا عبارت کسی کے دل پر یا زبان جاری کی جاتی ہے
اور وہ شخص اندھے کیطرح ہو جاتا ہے نہیں جانتا کہ وہ عبارت کہاں سے آئی خدا سے یا شیطان سے سو ایسے
فقرات سے استغفار لازم ہے لیکن اگر ایک صالح اور نیک بندہ کو بے حجاب مکالمہ الٰہی شروع ہو جائے اور مخاطبہ اور
مکالمہ کیطور پر ایک کلام روشن لذیذ پُر معنے پُر حکمت پوری شوکت کے ساتھ اُسکو سنائی دے اور کم سے کم بارہا اسکو
ایسا اتفاق ہوا ہو کہ خدا میں اور اُسمیں عین بیداری میں دس مرتبہ سوال و جواب ہوا ہو اُس نے سوال
کیا خدا نے جواب دیا پھر اُسی وقت عین بیداری میں اُسنے کوئی اور عرض کی اور خدا نے اسکا بھی جواب
دیا پھر گذارش عاجزانہ کی خدا نے اُسکا بھی جواب عطا فرمایا ایسا ہی دس مرتبہ تک خدا میں اور اُسمیں
باتیں ہوتی رہیں اور خدا نے بارہا ان مکالمات میں اُسکی دعائیں منظور کی ہوں عمدہ عمدہ معارف
پر اُسکو اطلاع دی ہو آنیوالے واقعات کی اُسکو خبر دی ہو اور اپنے برہنہ مکالمہ سے بار بار کے سوال
و جواب میں اسکو مشرف کیا ہو تو ایسے شخص کو خدا تعالےٰ کا بہت شکر کرنا چاہئے اور سب سے
زیادہ خدا کی راہ میں فدا ہونا چاہئے کیونکہ خدا نے محض اپنے کرم سے اپنے تمام بندوں میں سے اسے
چن لیا اور اُن صدیقوں کا اُسکو وارث بنا دیا جو اس سے پہلے گذر چکے ہیں۔ یہ نعمت نہایت ہی
نادر الوقوع اور خوش قسمتی کی بات ہے جسکو ملی اس کے بعد جو کچھ ہے وہ ہیچ ہے۔ اس مرتبہ اور اس مقام
کے لوگ اسلام میں ہمیشہ ہوتے رہے ہیں اور ایک اسلام ہی ہے جس میں خدا بندہ سے قریب ہو کر
اس سے باتیں کرتا اور اس کے اندر بولتا ہے وہ اُسکے دل میں اپنا تخت بناتا اور اس کے اندر سے
اُسے آسمان کیطرف کھینچتا ہے اور اُسکو وہ سب نعمتیں عطا فرماتا ہے جو پہلوں کو دی گئیں۔ افسوس

اندھی دُنیا نہیں جانتی کہ انسان نزدیک ہوتا ہوتا کہاں تک پہنچ جاتا ہے وہ آپ تو قدم نہیں اُٹھاتے اور جو قدم اُٹھاتے تو یا تو اُسکو کافر ٹھیرایا جاتا ہے اور یا اسکو معبود ٹھیرا کر خدا کی جگہ دیجاتی ہے یہ دونوں ظلم ہیں ایک افراط سے ایک تفریط سے پیدا ہوئے مگر عقلمند کو چاہیئے کہ وہ کم ہمت نہ ہو اور اس مقام اور اس مرتبہ کا انکاری نہ رہے اور صاحب اس مرتبہ کی کسرشان نہ کرے اور نہ اسکی پوجا شروع کرے اس مرتبہ پر خدا تعالیٰ وہ تعلقات اس بندہ سے ظاہر کرتا ہے کہ گویا اپنی الوہیت کی چادر اسپر ڈالدیتا ہے اور ایسا شخص خدا کے دیکھنے کا آئینہ بنجاتا ہے یہی بھید ہے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مجھے دیکھا اُسنے خدا کو دیکھ لیا غرض یہ بندوں کے لئے انتہائی تقرب ہے اور اسپر تمام سلوک ختم ہو جاتے ہیں اور پوری تسلی ملتی ہے میں بنی نوع پر ظلم کرونگا اگر میں اسوقت ظاہر کروں کہ وہ مقام جس کی میں نے یہ تعریفیں کیں ہیں اور وہ مرتبہ مکالمہ و مخاطبہ کا جسکی میں نے اسوقت تفصیل بیان کی وہ خدا کی عنایت نے مجھے عنایت فرمایا ہے تا میں اندھوں کو بینائی بخشوں اور ڈھونڈھنے والوں کو اُس گمگشتہ کا پتہ دوں اور سچائی قبول کرنیوالوں کو اُس پاک چشمہ کی خوشخبری سُناؤں جسکا تذکرہ بہتوں میں ہے اور پانیوالے بھوڑے ہیں۔ میں سامعین کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ خدا جس کے ملنے میں انسان کی نجات اور دائمی خوشحالی ہے وہ بجز قرآن شریف کی پیروی کے ہرگز نہیں ملسکتا کاش جو میں نے دیکھا ہے لوگ دیکھیں جو میں نے سُنا ہے وہ سُنیں اور قصوں کو چھوڑیں اور حقیقت کیطرف دوڑیں وہ کامل علم کا ذریعہ جس سے خدا نظر آتا ہے وہ میل اُتارنیوالا پانی جس سے تمام شکوک دور ہو جاتے ہیں وہ آئینہ جس سے اس برتر ہستی کا درشن ہو جاتا ہے خدا کا وہ مکالمہ اور مخاطبہ ہے جسکا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں جس کی روح میں سچائی کی طلب ہے وہ اُٹھے اور تلاش کرے میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر روحوں میں سچی تلاش پیدا ہو اور دلوں میں سچی پیاس لگ جائے تو لوگ اس طریق کو ڈھونڈھیں اور اس راہ کی تلاش میں لگیں مگر یہ راہ کس طریق سے کھلیگی اور حجاب کس دوا سے اُٹھیگا میں سب طالبوں کو یقین دلاتا ہوں کہ صرف اسلام ہی ہے جو اس راہ کی خوشخبری دیتا ہے اور دوسری قومیں تو خدا کے الہام پر مدت سے مُہر لگا چکی ہیں سو یقیناً سمجھو کہ یہ خدا کی طرف سے مُہر نہیں بلکہ محرومی کی وجہ سے انسان ایک حیلہ پیدا کر لیتا ہے اور یقیناً سمجھو کہ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ہم بغیر آنکھوں کے دیکھ سکیں یا بغیر کانوں کے سُن سکیں یا بغیر زبان کے بول سکیں اسیطرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ بغیر قرآن کے اس پیارے محبوب کا مُنہ دیکھ سکیں۔

میں جوان تھا اب بوڑھا ہوا مگر میں نے کوئی نہ پایا جس نے بغیر اس پاک چشمہ کے اس کھلی کھلی معرفت کا پیالہ پیا ہو
اے عزیزو! اے پیارو! کوئی اِنسان خدا کے ارادوں میں اُس سے لڑائی نہیں کر سکتا یقیناً
سمجھ لو کہ کامل علم کا ذریعہ خدا تعالیٰ کا الہام ہے جو خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں کو ملا پھر بعد اُس کے اس
خُدا نے جو دریائے فیض ہے یہ ہرگز نہ چاہا کہ آئندہ اس الہام کو مُہر لگا دے اور اس طرح پر دُنیا کو تباہ کرے بلکہ
اس کے الہام اور مکالمہ اور مخاطبہ کے ہمیشہ دروازے کھلے ہیں۔ ہاں ان کو انکی راہوں سے ڈھونڈو تب وہ
آسانی سے تمہیں ملیں گے وہ زندگی کا پانی آسمان سے آیا اور مناسب مقام پر ٹھیرا اب تمہیں کیا کرنا
چاہئے تا تم اُس پانی کو پی سکو یہی کرنا چاہئے کہ اُفتاں و خیزاں اس چشمہ تک پہنچو پھر اپنا مُنہ اس چشمہ
کے آگے رکھدو تا اس زندگی کے پانی سے سیراب ہو جاؤ۔ اِنسان کی تمام سعادت اسی میں ہے کہ
جہاں روشنی کا پتہ ملے اُسی طرف دوڑے اور جہاں اُس گمگشتہ دوست کا نشان پیدا ہو اُسی راہ کو اختیار کرے
دیکھتے ہو کہ ہمیشہ آسمان سے روشنی اُترتی اور زمین پر پڑتی ہے اسیطرح ہدایت کا سچا نُور آسمان سے ہی
اُترتا ہے۔ اِنسان کی اپنی ہی باتیں اور اپنی ہی اٹکلیں سچا گیان اسکو بخش نہیں سکتیں کیا تم خدا
کو بغیر خُدا کی تجلی کے پا سکتے ہو کیا تم بغیر اس آسمانی روشنی کے اندھیرے میں دیکھ سکتے ہو اگر دیکھ سکتے
ہو تو شائد اس جگہ بھی دیکھ لو مگر ہماری آنکھیں گو بینا ہوں تا ہم آسمانی روشنی کی محتاج ہیں اور ہمارے کان
گو شنوا ہوں تا ہم اس ہوا کے حاجتمند ہیں جو خدا کی طرف سے چلتی ہیں وہ خُدا سچا خُدا نہیں ہے جو
خاموش ہے اور سارا مدار ہماری اٹکلوں پر ہے بلکہ کامل اور زندہ خُدا وہ ہے جو اپنے وجود کا آپ پتہ
دیتا رہا ہے اور اب بھی اُس نے یہی چاہا ہے کہ آپ اپنے وجود کا پتہ دیوے آسمانی کھڑکیاں کھلنے
کو ہیں عنقریب صبح صادق ہونیوالی ہے مُبارک وہ جو اُٹھ بیٹھیں اور اب سچے خُدا کو ڈھونڈھیں وہی خُدا
جسپر کوئی گردش یا مُصیبت نہیں آتی جس کے جلال کی چمک پر کبھی حادثہ نہیں پڑتا قرآن شریف
میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی خدا ہی ہے جو ہر دم آسمان کا نُور اور
زمین کا نُور ہے اُسی سے ہر ایک جگہ روشنی پڑتی ہے آفتاب کا وہی آفتاب ہے زمین کے تمام جانداروں
کی وُہی جان ہے سچا زندہ خُدا وہی ہے مُبارک وہ جو اسکو قبول کرے۔

تیسرا علم کا ذریعہ وہ اُمور ہیں جو حق الیقین کے مرتبہ پر ہیں اور وہ تمام شدائد اور مصائب اور
تکالیف ہیں جو خُدا کے نبیوں اور راستبازوں کو مخالفوں کے ہاتھ سے یا آسمانی قضا و قدر سے

پُہنچتی ہیں اور اس قسم کے دُکھوں اور تکلیفوں سے وُہ تمام شرعی ہدایتیں جو محض علمی طور پر انسان کے دِل میں تھیں اسپر وارد ہو کر عملی رنگ میں آجاتی ہیں اور پھر عمل کی زمین سے نشوونما پا کر کمال تام تک پہنچ جاتی ہیں اور عمل کرنیوالوں کا اپنا ہی وجود ایک نسخہ مکمل خدا کی ہدایتوں کا ہو جاتا ہے اور وہ تمام اخلاق عفو اور انتقام اور صبر اور رحم وغیرہ جو صرف دماغ اور دل میں بھرے ہُوئے تھے اب تمام اعضا کو عملی مزاولت کی برکت سے اُنسے حصّہ مِلتا ہے اور وہ تمام جسم پر وارد ہو کر اپنے نقش و نگار اُسپر جما دیتے ہیں جیسا کہ اللہ جلشانہ فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ط أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ یعنی ہم تمہیں خوف اور فاقہ اور مال کے نقصان اور جان کے نُقصان اور کوشش ضائع جانے اور اولاد کے فوت ہونے سے آزمائینگے یعنی یہ تمام تکلیفیں قضا و قدر کے طور پر یا دُشمن کے ہاتھ سے تمہیں پہنچینگی سو اُن لوگوں کو خوشخبری ہو جو مُصیبت کے وقت صرف یہ کہتے ہیں کہ ہم خُدا کے ہیں اور خدا کی طرف رجوع کریں گے ان لوگوں پر خُدا کا درُود اور رحمت ہے اور یہی وُہ لوگ ہیں جو ہدایت کے کمال تک پُہنچ گئے ہیں یعنی محض اس علم میں کچھ شرف اور بزرگی نہیں جو صرف دماغ اور دِل میں بھرا ہُوا ہو بلکہ حقیقت میں علم وُہ ہے کہ دماغ سے اُتر کر تمام اعضاء اسکے متادب و رنگین ہو جائیں اور حافظہ کی یادداشتیں عملی رنگ میں دکھائی دیں سو علم کے مستحکم کرنے اور اس کے ترقی دینے کا یہ بڑا ذریعہ ہے کہ عملی طور پر اس کے نقوش اپنے اعضا میں جما لیں کوئی ادنٰے علم بھی عملی مزاولت کے بغیر اپنے کمال کو نہیں پہنچتا مثلاً مُدّت دراز سے ہمارے علم میں یہ بات ہے کہ روٹی پکانا نہایت ہی سہل بات ہے اور اسمیں کوئی زیادہ باریکی نہیں صرف اتنا ہے کہ آٹا گُوندھ کر اور بقدر ایک ایک روٹی کے اس آٹے کے پیڑے بنا دیں اور اُنکو دونوں ہاتھوں کے باہم ملانے سے چوڑے کر کے توے پر ڈالدیں اور ادھر اُدھر پھیر کر اور آگ پر سینک کر رکھ لیں روٹی پک جائیگی یہ تو ہماری صرف علمی لاف و گزاف ہے لیکن جب ہم ناتجربہ کاری کی حالت میں پکانے لگیں گے تو اول تو ہمپر یہی مُصیبت پڑے گی کہ آٹے کو اسکے مناسب قوام پر

رکھ سکیں بلکہ یا تو پتھر سا رہیگا یا پتلا ہو کر گلگلوں کے لائق ہو جائیگا اور اگر مر کر اور تھک تھک کر گوندھ
بھی لیا تو روٹی کا یہ حال ہوگا کہ کچھ جلیگی اور کچھ کچی رہیگی۔ بیچ میں ٹکیا رہیگی اور کئی طرف سے کان نکلے
ہوئے ہونگے حالانکہ پچاس برس تک ہم پکتی ہوئی دیکھتے رہے غرض مجرد علم کی شامت سے جو عملی مشق کے
نیچے نہیں آیا کئی سیر آٹے کا نقصان کرینگے۔ پھر جبکہ ادنےٰ ادنےٰ سی بات میں ہمارے علم کا یہ حال
ہے تو بڑے بڑے امور میں بجز عملی مزاولت اور مشق کے صرف علم پر کیونکر بھروسہ رکھیں سو خدا تعالیٰ
اِن آیتوں میں یہ سکھاتا ہے کہ جو مصیبتیں میں تم پر ڈالتا ہوں وہ بھی علم اور تجربہ کا ذریعہ ہیں یعنی اُن سے
تمہارا علم کامل ہوتا ہے اور پھر آگے فرماتا ہے کہ تم اپنے مالوں اور جانوں میں بھی آزمائے جاؤگے
لوگ تمہارے مال لوٹیں گے تمہیں قتل کرینگے اور تم یہودیوں اور عیسائیوں اور مشرکوں کے ہاتھ سے
بہت ہی ستائے جاؤگے وہ بہت کچھ ایذا کی باتیں تمہارے حق میں کہینگے پس اگر تم صبر کروگے اور بیجا باتوں
سے بچوگے تو یہ ہمت اور بہادری کا کام ہوگا۔ ان تمام آیات کا مطلب یہ ہے کہ بابرکت علم وہی ہوتا ہے جو
عمل کے مرتبہ میں اپنی چمک دکھاوے اور منحوس علم وہ ہے جو صرف علم کی حد تک ہی رہے کبھی عمل تک نوبت نہ پہنچے۔

جاننا چاہئے کہ جس طرح مال تجارت سے بڑھتا ہے اور پھولتا ہے ایسا ہی علم عملی مزاولت سے اپنے
روحانی کمال کو پہنچتا ہے۔ سو علم کو کمال تک پہنچانیکا بڑا ذریعہ عملی مزاولت ہے مزاولت سے علم
میں نور آجاتا ہے اور یہ بھی سمجھو کہ علم کا حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچنا اور کیا ہوتا ہے یہی تو ہے کہ عملی
طور پر ہر ایک گوشہ اُسکا آزمایا جائے چنانچہ اسلام میں ایسا ہی ہوا جو کچھ خدا تعالےٰ نے قرآن
کے ذریعہ سے لوگوں کو سکھایا انکو یہ موقعہ دیا کہ عملی طور پر اس تعلیم کو چمکا دیں اور اُسکے نور سے پُر
ہو جاویں۔ اِسی غرض سے خدا تعالےٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح کو دو حصہ پر منقسم
کر دیا ایک حصہ دکھوں اور مصیبتوں اور تکلیفوں کا اور دوسرا حصہ فتحیابی کا تا مصیبتوں کے وقت
میں وہ خلق ظاہر ہوں جو مصیبتوں کے وقت ظاہر ہوتے ہیں اور فتح اور اقتدار کے وقت میں وہ خلق ثابت
ہوں جو بغیر اقتدار کے ثابت نہیں ہوتے سو ایسا ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دونوں قسم کے
اخلاق دونوں زمانوں اور دونوں حالتوں کے وارد ہونے سے کمال وضاحت سے ثابت ہو گئے
چنانچہ وہ مصیبتوں کا زمانہ جو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر تیرہ برس تک مکہ معظمہ میں شامل حال
رہا اس زمانہ کی سوانح پڑھنے سے نہایت واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

وہ اخلاق جو مصیبتوں کے وقت کامل راستباز کو دکھلانے چاہئیں یعنی خدا پر توکل رکھنا اور جزع فزع سے کنارہ کرنا اور اپنے کام میں سست نہ ہونا اور کسی کے رعب سے نہ ڈرنا ایسے طور پر دکھلائے جو کفار ایسی استقامت کو دیکھ کر ایمان لائے اور شہادت دی کہ جب تک کسی کا پورا بھروسہ خدا پر نہ ہو تو اس استقامت اور اس طور سے دکھوں کی برداشت نہیں کر سکتا۔

اور پھر جب دوسرا زمانہ آیا یعنی فتح اور اقتدار اور ثروت کا زمانہ تو اس زمانہ میں بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق عفو اور سخاوت اور شجاعت کے ایسے کمال کے ساتھ صادر ہوئے جو ایک گروہ کثیر کفار کا انہیں اخلاق کو دیکھ کر ایمان لایا۔ دکھ دینے والوں کو بخشا اور شہر سے نکالنے والوں کو امن دیا۔ انکے محتاجوں کو مال سے مالا مال کر دیا۔ اور قابو پا کر اپنے بڑے بڑے دشمنوں کو بخش دیا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے آپکے اخلاق کو دیکھ کر گواہی دی کہ جب تک کوئی خدا کی طرف سے اور حقیقۃً راستباز نہ ہو یہ اخلاق ہرگز دکھا نہیں سکتا یہی وجہ ہے کہ آپ کے دشمنوں کے پرانے کینے یک لخت دور ہو گئے آپ کا بڑا بھاری خلق جسکو آپنے ثابت کر کے دکھلا دیا وہ خلق تھا جو قرآن شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے اور وہ یہ ہے قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی انکو کہدے کہ میری عبادت اور میری قربانی اور میرا مرنا اور میرا جینا خدا کی راہ میں ہے یعنے اسکا جلال ظاہر کرنے کے لئے اور نیز اسکے بندوں کے آرام دینے کے لئے ہے تا میرے مرنے سے ان کو زندگی حاصل ہو۔ اس جگہ جو خدا کی راہ میں اور بندوں کی بھلائی کے لئے مرنیکا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ آپنے نعوذ باللہ جاہلوں یا دیوانوں کی طرح درحقیقت خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا اس وہم سے کہ اپنے تئیں کسی آلہ قتل کے ذریعہ سے ہلاک کر دینا اوروں کو فائدہ پہنچائیگا بلکہ آپ ان بیہودہ باتوں کے سخت مخالف تھے اور قرآن ایسی خودکشی کے مرتکب کو سخت مجرم اور قابل سزا ٹھیراتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ یعنے خودکشی نہ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنی موت کے باعث نہ ٹھیرو اور یہ ظاہر ہے کہ اگر مثلاً خالد کے پیٹ میں درد ہو اور زید اسپر رحم کر کے اپنا سر پھوڑے تو زید نے خالد کے حق میں کوئی نیکی کا کام نہیں کیا بلکہ اپنے سر کو احمقانہ حرکت سے ناحق پھوڑا نیکی کا کام تب ہوتا کہ جب زید خالد کی خدمت میں مناسب اور مفید طریق کے ساتھ سرگرم رہتا اور اسکے لئے عمدہ دوائیں میسر کرتا اور طبابت کے قواعد کے موافق اسکا علاج کرتا مگر اس کے سر کے پھوڑنے سے زید کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچا ناحق اس نے اپنے وجود کے ایک شریف عضو کو دکھ پہنچایا۔ غرض اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم

نے واقعی ہمدردی اور محنت اُٹھانے سے بنی نوع کی رہائی کے لئے جان کو وقف کر دیا تھا اور دُعا کے ساتھ اور تبلیغ کے ساتھ اور ان کے جور وجفا اُٹھانے کے ساتھ اور ہر ایک مناسب اور حکیمانہ طریق کے ساتھ اپنی جان اور اپنے آرام کو اس راہ میں فدا کر دیا تھا جیسا کہ اللہ جلشانہ فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ کیا تو اس غم اور سخت محنت میں جو لوگوں کے لئے اُٹھا رہا ہے اپنے تئیں ہلاک کر دیگا اور کیا اُن لوگوں کے لئے جو حق کو قبول نہیں کرتے تو حسرتیں کھا کھا کر اپنی جان دیگا سو قوم کی راہ میں جان دینے کا حکیمانہ طریق یہی ہے کہ قوم کی بھلائی کیلئے قانونِ قدرت کی مُفید راہوں کے موافق اپنی جان پر سختی اُٹھاویں اور مناسب تدبیروں کے بجالانے سے اپنی جان اپنر فدا کر دیں نہ یہ کہ قوم کو سخت بلایا گمراہی میں دیکھ کر اور خطرناک حالت میں پاکر اپنے سر پر پتھر مار لیں یا دو تین رتی اسٹر کینا کھا کر اس جہان سے رخصت ہو جائیں اور پھر گمان کریں کہ ہمنے اپنی اس حرکت بیجا سے قوم کو نجات دیدی ہے یہ مردوں کا کام نہیں ہے زنانہ خصلتیں ہیں اور بے حوصلہ لوگوں کا ہمیشہ سے یہی طریق ہے کہ مصیبت کو قابلِ برداشت نہ پاکر جھٹ پٹ خودکشی کیطرف دوڑتے ہیں ایسی خودکشی کی بعد میں کتنی ہی تاویلیں کیجائیں مگر یہ حرکت بلاشبہ عقل اور عقلمندوں کا ننگ ہے مگر ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا صبر اور دُشمن کا مُقابلہ نہ کرنا معتبر نہیں ہے جسکو انتقام کا موقع ہی نہ ملا کیونکہ کیا معلوم ہے کہ اگر وہ انتقام پر قدرت پاتا تو کیا کچھ کرتا جب تک انسان پر وُہ زمانہ نہ آوے جو ایک مُصیبتوں کا زمانہ اور ایک مقدرت اور حکومت اور ثروت کا کا زمانہ ہو اس وقت تک اس کے سچے اخلاق ہرگز ظاہر نہیں ہو سکتے۔ صاف ظاہر ہے کہ جو شخص صرف کمزوری اور ناداری اور بے اقتداری کی حالت میں لوگوں کی ماریں کھاتا مرجاوے اور اقتدار اور حکومت اور ثروت کا زمانہ نہ پاوے اسکے اخلاق میں سے کچھ بھی ثابت نہ ہوگا اور اگر کسی میدان جنگ میں حاضر نہیں ہؤا تو یہ بھی ثابت نہیں ہوگا کہ وہ دل کا بہادر تھا یا بُزدل ہوگا۔ اس کے اخلاق کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم نہیں جانتے ہیں کیا معلوم ہے کہ اگر وہ اپنے دشمنوں پر قدرت پاتا تو ان سے کیا سلوک بجالاتا اور اگر وہ دولتمند ہو جاتا تو اس دولت کو جمع کرتا یا لوگوں کو دیتا اور اگر وہ کسی میدان جنگ میں آتا تو دُم دبا کر بھاگ جاتا یا بہادروں کیطرح ہاتھ دکھاتا مگر خُدا کی عنایت اور فضل نے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو ان اخلاق کے ظاہر کرنیکا موقع دیا چنانچہ سخاوت اور شجاعت اور حلم اور عفو اور عدل اپنے اپنے موقع پر ایسے کمال سے ظہور میں آئے کہ صفحۂ دُنیا میں اس کی نظیر

ڈھونڈھنا لاحاصل ہے اپنے دونوں زمانوں ضعف اور قدرت اور ناداری اور ثروت میں تمام جہان کو دکھلا دیا کہ وہ ذات پاک کیسی اعلےٰ درجہ کے اخلاق کی جامع تھی اور کوئی انسانی خلق اخلاق فاضلہ میں سے ایسا نہیں ہے جو اس کے ظاہر ہونے کیلئے آپ کو خدا تعالیٰ نے ایک موقع نہ دیا شجاعت۔ سخاوت۔ استقلال۔ عفو۔ حلم۔ وغیرہ وغیرہ تمام اخلاق فاضلہ ایسے طور پر ثابت ہو گئے کہ دنیا میں اسکی نظیر کا تلاش کرنا طلب محال ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جنہوں نے ظلم کو انتہا تک پہنچا دیا اور اسلام کو نابود کرنا چاہا خدا نے اُن کو بھی بے سزا نہیں چھوڑا کیونکہ انکو بے سزا چھوڑنا گویا راستبازوں کو اُنکے پیروں کے نیچے ہلاک کرنا تھا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی لڑائیوں کی ہرگز یہ غرض نہ تھی کہ خواہ نخواہ لوگوں کو قتل کیا جائے وہ اپنے باپ دادا کے ملک سے نکالے گئے تھے اور بہت سے مسلمان مرد اور عورتیں بے گناہ شہید کئے گئے تھے اور ابھی ظالم ظلم سے باز نہیں آتے تھے اور اسلام کی تعلیم کو روکتے تھے لہذا خدا کے قانون حفاظت نے یہ چاہا کہ مظلوموں کو بالکل نابود ہونے سے بچالے جنہوں نے تلوار اٹھائی تھی انہیں کیساتھ تلوار کا مقابلہ ہوا۔ غرض قتل کرنیوالوں کا فتنہ فرو کرنے کے لئے بطور مدافعت شر کے وہ لڑائیاں تھیں اور اُسوقت ہوئیں جبکہ ظالم طبع لوگ اہل حق کو نابود کرنا چاہتے تھے۔ اس حالت میں اگر اسلام اس حفاظت اختیاری کو عمل میں نہ لاتا تو ہزاروں بچے اور عورتیں بے گناہ قتل ہو کر آخر اسلام نابود ہو جاتا۔ یاد رہے کہ ہمارے مخالفین کی یہ بڑی زبردستی ہے کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ الہامی ہدایت ایسی ہونی چاہئے جس کے کسی مقام اور کسی محل میں دشمنوں کے مقابلہ کی تعلیم نہ ہو اور ہمیشہ حلم اور نرمی کے پیرایہ میں اپنی محبت اور رحمت کو ظاہر کرے ایسے لوگ اپنی دانست میں خدائے عزوجل کی بڑی تعظیم کر رہے ہیں کہ جو اسکی صفات کاملہ کو صرف نرمی اور ملائمت پر ہی ختم کرتے ہیں لیکن اس معاملے میں فکر اور غور کرنے والوں پر باسانی کھل سکتا ہے کہ یہ لوگ بڑی موٹی موٹی اور فاش غلطی میں مبتلا ہیں۔ خدا کے قانون قدرت پر نظر ڈالنے سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کے لئے وہ رحمت محض تو ضرور ہے مگر وہ رحمت ہمیشہ اور ہر حال میں نرمی اور ملائمت کے رنگ میں ظہور پذیر نہیں ہوتی بلکہ وہ سراسر رحمت کے تقاضا سے طبیب حاذق کی طرح کبھی شربت شیریں ہمیں پلاتا ہے اور کبھی دوائی تلخ دیتا ہے اس کی رحمت نوع انسان پر اس طرح وارد ہوتی ہے جیسے ہم میں سے ایک شخص اپنے تمام وجود پر رحمت رکھتا ہے اس بات میں

کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ ہر ایک فرد ہم میں سے اپنے سارے وجود سے پیار رکھتا ہے اور اگر کوئی ہمارے ایک بال کو اکھاڑنا چاہے تو ہم اُس پر سخت ناراض ہوتے ہیں لیکن باوصف اس کے کہ ہماری محبت جو ہم اپنے وجود سے رکھتے ہیں ہمارے تمام وجود میں بٹی ہوئی ہے اور تمام اعضا ہمارے لئے پیارے ہیں ہم کسی کا نقصان نہیں چاہتے مگر پھر بھی یہ بات بداہت ثابت ہے کہ ہم اپنے تمام اعضا سے ایک ہی درجہ کی اور یکساں محبت نہیں رکھتے بلکہ اعضا رئیسہ و شریفہ کی محبت جن پر ہمارے مقاصد کا بہت کچھ مدار ہے ہمارے دلوں پر غالب ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہماری نظر میں ایک ہی عضو کی محبت کی نسبت مجموعہ اعضا کی محبت ...... بہت بڑھ کر ہوتی ہے پس جب کبھی ہمارے لئے کوئی ایسا موقع آپڑتا ہے کہ ایک عضو کا بچاؤ ادنے درجہ کے عضو کے زخمی کرنے یا کاٹنے یا توڑنے پر موقوف ہوتا ہے تو ہم جان کے بچانے کیلئے بلا تامل اُسی عضو کے زخمی کرنے یا کاٹنے پر مستعد ہو جاتے ہیں اور گو اسوقت ہمارے دل میں رنج بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے ایک پیارے عضو کو زخمی کرتے یا کاٹتے ہیں مگر اِس خیال سے کہ اس عضو کا فساد کسی دوسرے شریف عضو کو بھی ساتھ ہی تباہ نہ کرے ہم کاٹنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں پس اسی مثال سے سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا بھی جب دیکھتا ہے کہ اسکے راستباز باطل پرستوں کے ہاتھ سے ہلاک ہوتے ہیں اور فساد پھیلتا ہے تو راستبازوں کی جان کے بچاؤ اور فساد کے فرو کرنے کے لئے مناسب تدبیر ظہور میں لاتا ہے خواہ آسمان سے خواہ زمین سے اِسلئے کہ وہ جیسا کہ رحیم ہے ویسا ہی حکیم ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

حضرت مسیحؑ کا دس گم شدہ اسرائیلی قوموں کی طرف جانا

قرآن شریف اور حدیث کی شہادت

اگرچہ عیسائی کہہ سکتے ہیں کہ وہ قرآن شریف کی کسی آیت یا کسی حدیث کو اپنے لئے حجت

نہیں سمجھ سکتے لیکن ہم نے محض اس غرض سے ان کو لکھا ہے کہ تا عیسائیوں کو قرآن شریف اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ معلوم ہو اور اُنپر یہ حقیقت کھلے کہ کیونکر وہ سچائیاں جو صدہا برس کے بعد اب معلوم ہوئی ہیں وہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم نے پہلے سے بیان کر دی ہیں۔ چنانچہ اُنہیں سے کسی قدر ذیل میں لکھتا ہوں:-

اللہ تعالےٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ الآیۃ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا الآیۃ یعنی یہودیوں نے نہ حضرت مسیح کو درحقیقت قتل کیا اور نہ بذریعہ صلیب ہلاک کیا بلکہ انکو محض ایک شبہ پیدا ہوا کہ گویا حضرت عیسیٰ صلیب پر فوت ہو گئے ہیں اور اُن کے پاس وہ دلائل نہیں ہیں جنکی وجہ سے اُن کے دل اس بات پر مطمئن ہو سکیں کہ یقیناً حضرت مسیح علیہ السلام کی صلیب پر جان نکل گئی تھی۔

اِن آیات میں اللہ تعالےٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اگرچہ یہ سچ ہے کہ بظاہر مسیح صلیب پر کھینچا گیا اور اُسکے مارنیکا ارادہ کیا گیا مگر یہ محض ایک دھوکا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ایسا خیال کر لیا کہ درحقیقت حضرت مسیح علیہ السلام کی جان صلیب پر نکل گئی تھی بلکہ خدا نے ایسے اسباب پیدا کر دئیے جن کی وجہ سے وہ صلیبی موت سے بچ رہا۔ اب انصاف کرنیکا مقام ہے کہ جو کچھ قرآن کریم نے یہود اور نصاریٰ کے برخلاف فرمایا تھا آخر کار وہی بات سچی نکلی اور اس زمانہ کی اعلیٰ درجہ کی تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت مسیح درحقیقت صلیبی موت سے بچائے گئے تھے۔ کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ یہودی اس بات کا جواب دینے سے قاصر رہے کہ کیونکر حضرت مسیح علیہ السلام کی جان بغیر ہڈیاں توڑنے کے صرف دو تین گھنٹہ میں نکل گئی اسی وجہ سے بعض یہودیوں نے ایک اور بات بنائی ہے کہ ہمنے مسیح کو تلوار سے قتل کر دیا تھا۔ حالانکہ یہودیوں کی پرانی تاریخ کے رُو سے مسیح کو تلوار کے ذریعہ سے قتل کرنا ثابت نہیں۔ یہ اللہ تعالےٰ کی شان ہے کہ مسیح کے بچانے کے لئے اندھیرا ہوا بھونچال آیا پلاطوس کی بیوی کو خواب آئی سبت کے دن کی رات قریب آ گئی جس میں مصلوبوں کو صلیب پر رکھنا روا نہ تھا۔ حاکم کا دل بوجہ ہولناک خواب کے مسیح کے چھوڑانے کے لئے متوجہ ہوا۔ یہ تمام واقعات خدا نے اسلئے ایک ہی دفعہ پیدا کر دئے کہ تا مسیح کی جان بچ جائے اس کے علاوہ مسیح کو غشی کی حالت میں کر دیا کہ تا ہر ایک کو مُردہ معلوم ہو۔ اور یہودیوں پر اُس وقت ہیبت ناک نشان بھونچال وغیرہ کے دکھلا کر بزدلی اور خوف اور عذاب کا

اندیشہ طاری کر دیا - اور یہ ڈر کہ اسکے علاوہ تھا کہ سبت کی رات میں لاشیں صلیب پر نہ رہ جائیں - پھر یہ بھی ہوا کہ یہودیوں نے مسیح کو غشی میں دیکھکر سمجھ لیا کہ فوت ہو گیا - اندھیرے اور بھونچال اور گھبراہٹ کا وقت تھا گھروں کا بھی انکو فکر پڑا کہ شائد اس بھونچال اور اندھیرے سے بچوں پر کیا گذرتی ہوگی اور یہ دہشت بھی دلوں پر غالب ہوئی کہ اگر یہ شخص کاذب اور کافر تھا جیسا کہ ہمنے سمجھا ہے تو اسکے اس دکھ دینے کے وقت ایسے ہولناک آثار کیوں ظاہر ہوئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے - لہذا انکے دل بیقرار ہو کر اس لائق نہ رہے کہ وہ مسیح کو اچھی طرح دیکھتے کہ آیا مر گیا یا کیا حال ہے - مگر درحقیقت یہ سب امور مسیح کے بچانے کے لئے خدائی تدبیریں تھیں - اسی کیطرف اس آیت میں اشارہ ہے ولکن شبہ لھم یعنی یہودی مسیح کو جان سے مارا نہیں ہے لیکن خدا نے ان کو شبہ میں ڈال دیا کہ گویا جان سے مار دیا ہے اس سے راستبازوں کو خدا تعالیٰ کے فضل پر بڑی امید بڑھتی ہے کہ جس طرح اپنے بندوں کو چاہے بچا لے -

اور قرآن شریف میں ایک یہ بھی آیت حضرت مسیح کے حق میں ہے وجیھا فی الدنیا والاخرۃ و من المقربین - اسکا ترجمہ یہ ہے کہ دنیا میں بھی مسیح کو اس کی زندگی میں وجاہت یعنے عزت اور مرتبہ اور عام لوگوں کی نظر میں عظمت اور بزرگی ملیگی اور آخرت میں بھی - اب ظاہر ہے کہ حضرت مسیح نے ہیرودیس اور پلاطوس کے علاقہ میں کوئی عزت نہیں پائی بلکہ غایت درجہ کی تحقیر کی گئی - اور یہ خیال کہ دنیا میں پھر آکر عزت اور بزرگی پائینگے یہ ایک بے اصل وہم ہے جو نہ صرف خدا تعالیٰ کی کتابوں کے منشاء کے مخالف بلکہ اس کے قدیم قانون قدرت سے بھی مغائر اور مباین اور پھر ایک بے ثبوت امر ہے مگر واقعی اور سچی بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس بدبخت قوم کے ہاتھ سے نجات پا کر جب ملک پنجاب کو اپنی تشریف آوری سے فخر بخشا تو اس ملک میں خدا تعالیٰ نے ان کو بہت عزت اور بنی اسرائیل کی وہ دس قومیں جو گم تھیں اس جگہ آکر ان کو ملگئیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اس ملک میں آکر اکثر انہیں سے بدھ مذہب میں داخل ہو گئے تھے اور بعض ذلیل قسم کی بت پرستی میں پھنس گئے تھے - سو اکثر ان کے حضرت مسیح کے اس ملک میں آنے سے راہ راست پر آ گئے - اور چونکہ حضرت مسیح کی دعوت میں آنیوالے نبی کے قبول کرنے کے لئے وصیت تھی اسلئے وہ دس فرقے جو اس ملک میں آکر افغان اور کشمیری کہلائے آخر کار سب کے سب مسلمان ہو گئے - غرض اس ملک میں حضرت مسیح کو بڑی وجاہت پیدا ہوئی - قرآن شریف

ہیں ایک یہ بھی آیت ہے وجعلنی مبارکاً اینما کنت کہ مسیح کو خدا نے ایسی برکت دی ہے کہ جہاں جائیگا وہ مبارک ہوگا۔ اس سے ثابت ہے کہ اُسنے خدا سے بڑی برکت پائی اور وہ فوت نہ ہوا جبتک اس کو ایک شاہانہ عزت دیگئی۔ اسیطرح قرآن شریف میں ایک یہ بھی آیت ہے، ومطھرک من الذین کفروا یعنے اے عیسیٰ میں اُن الزاموں سے تجھے بری کرونگا۔ اور تیرا پاک دامن ہونا ثابت کر دونگا اور اُن تہمتوں کو دور کرونگا جو تیرے پر یہود اور نصاریٰ نے لگائیں۔ یہ ایک بڑی پیشگوئی تھی اور اسکا ماحصل یہی ہے کہ یہود نے یہ تہمت لگائی تھی کہ نعوذ باللہ حضرت مسیح مصلوب ہو کر ملعون ہو گئے اور خدا کی محبت انکے دل میں سے جاتی رہی اور جیساکہ لعنت کے مفہوم کے لئے شرط ہے اُن کا دل خدا سے برگشتہ اور خدا سے بیزار ہوگیا اور تاریکی کے بے انتہاء طوفان میں پڑ گیا اور بدیوں سے محبت کرنے لگا اور کل نیکیوں کا مخالف ہو گیا اور خدا سے تعلق توڑ کر شیطان کی بادشاہت کے ماتحت ہو گیا اور اُسمیں اور خدا میں حقیقی دشمنی پیدا ہو گئی۔ اور یہی تہمت ملعون ہونے کی نصاریٰ نے بھی لگائی تھی مگر نصاریٰ نے اپنی نادانی سے دو ضدوں کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا۔ اُنہوں نے ایکطرف تو حضرت مسیح کو خدا کا فرزند قرار دیا اور دوسری طرف ملعون بھی قرار دیا ہے اور خود مانتے ہیں کہ ملعون تاریکی اور شیطان کا فرزند ہوتا ہے یا خود شیطان ہوتا ہے۔ سو حضرت مسیح پر یہ سخت ناپاک تہمتیں لگائی گئی تھیں۔ اور "مطھرک" کی پیشگوئی میں یہ اشارہ ہے کہ ایک زمانہ وہ آتا ہے کہ خدا تعالےٰ ان الزاموں سے حضرت مسیح کو پاک کریگا اور یہی وہ زمانہ ہے۔

اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تطہیر ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی گواہی کی گواہی سے بھی عقلمندوں کی نظروں میں بخوبی ہو گئی کیونکہ آنجناب نے اور قرآن شریف نے گواہی دی کہ وہ الزام سب جھوٹے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لگائے گئے تھے۔ لیکن یہ گواہی عوام کی نظر میں نظری اور باریک تھی اس لئے اللہ تعالےٰ کے انصاف نے یہی چاہا کہ جیساکہ حضرت مسیح علیہ السلام کو مصلوب کرنا ایک مشہود امر تھا اور اُمور بدیہیہ مشہودہ محسوسہ میں سے تھا اسی طرح تطہیر اور بریت بھی امور مشہودہ محسوسہ میں سے ہونی چاہئے۔ سو اب اسی کے موافق ظہور میں آیا یعنے تطہیر بھی صرف نظری نہیں بلکہ محسوس طور پر ہو گئی اور لاکھوں انسانوں نے اس جسم کی آنکھ سے دیکھ لیا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی قبر سری نگر کشمیر میں موجود ہے اور جیساکہ گلگتہ یعنے سری کے مکان پر حضرت مسیح کو صلیب پر کھینچا گیا تھا ایسا ہی سری کے مکان پر یعنے سری نگر میں اُنکی قبر کا ہونا ثابت ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ دونوں موقعوں میں

سری کا لفظ موجود ہے یعنے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر کھینچے گئے اس مقام کا نام بھی گلگت یعنی سری ہے اور جہاں اُنیسویں صدی کے اخیر میں حضرت مسیح علیہ السلام کی قبر ثابت ہوئی اُس مقام کا نام بھی گلگت یعنی سری ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ گلگت جو کشمیر کے علاقہ میں ہے یہ بھی سری کی طرف ایک اشارہ ہے۔

اور احادیث میں معتبر روایتوں سے ثابت ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسیح کی عمر ایکسو پچیس ۱۲۵ برس کی ہوئی ہے۔ اور اس بات کو اسلام کے تمام فرقے مانتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام میں دو ایسی باتیں جمع ہوئی تھیں کہ کسی نبی میں وہ دونوں جمع نہیں ہوئیں۔ (۱) ایک یہ کہ اُنہوں نے کامل عمر پائی یعنی ایکسو پچیس برس زندہ رہے۔ (۲) دوم یہ کہ اُنہوں نے اکثر حصوں کی سیاحت کی اس لئے نبی سیاح کہلائے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر وہ تینتیس برس کی عمر میں آسمان کیطرف اُٹھائے جاتے تو اس صورت میں ایکسو پچیس ۱۲۵ برس کی روایت صحیح نہیں ٹھیر سکتی۔ اور نہ وہ اُس چھوٹی سی عمر میں یعنی تینتیس برس میں سیاحت کر سکتے تھے۔ اور یہ روایتیں نہ صرف حدیث کی معتبر اور قدیم کتابوں میں لکھی ہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے فرقوں میں اس تواتر سے مشہور ہیں کہ اس سے بڑھکر متصور نہیں۔ کنز العمال جو احادیث کی ایک جامع کتاب ہے اُس کے صفحہ ۳۴ میں ابوہریرہؓ سے یہ حدیث لکھی ہے اوحی اللہ تعالیٰ الی عیسیٰ ان یٰعیسیٰ انتقل من مکان الی مکان لئلا تعرف فتوذی یعنے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیطرف وحی بھیجی کہ اے عیسےٰ ایک مکان سے دُوسرے مکان کیطرف نقل کرتا رہ یعنے ایک مُلک سے دُوسرے مُلک کیطرف جا تاکہ کوئی تجھے پہچانکر دُکھ نہ دے۔ اور پھر اسی کتاب میں جابرؓ سے روایت کر کے یہ حدیث لکھی ہے۔ کان عیسیٰ ابن مریم یسیح فاذا امسیٰ اکل بقل الصحراء ولیشرب الماء القراح یعنے حضرت عیسےٰ علیہ السلام ہمیشہ سیاحت کیا کرتے تھے اور ایک مُلک سے دوسرے ملک کی طرف سیر کرتے تھے اور جہاں شام پڑتی تھی تو جنگل کے بقولات میں سے کچھ کھاتے تھے اور خالص پانی پیتے تھے۔ اور پھر اسی کتاب میں عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے جس کے یہ لفظ ہیں قال احب شئ الی اللہ الغرباء قیل ای شئ الغرباء۔ قال الذین یفرون بدینھم و یجتمعون الی عیسیٰ ابن مریم۔ یعنے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پیارے خدا کی جناب میں وہ لوگ ہیں جو غریب ہیں۔ پُوچھا گیا کہ غریب کے کیا معنے ہیں کہا وُہ لوگ ہیں جو عیسےٰ مسیح کی طرح دین لیکر اپنے مُلک سے بھاگتے ہیں۔

عصمتِ انبیاء پر بحث

جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ عصمتِ انبیاء پر جو مضمون سال گذشتہ میں آپکے رسالے میں نکلا تھا اُسپر کچھ عرصہ بعد عیسائیوں کے ایک اخبار اپی فینی میں بحث شروع ہو گئی مگر افسوس کہ ایڈیٹر اخبار نے اِس بحث کو انصاف کے ساتھ جاری نہیں رکھا بلکہ قبل اسکے کہ ہماری طرف سے اِسے مفصل جواب پہنچے بحث کو بند کر دیا۔ گویا ایڈیٹر کے نزدیک مذہبی سچائیاں بھی دو تین مہینہ میں زائد المیعاد ہو جاتی ہیں۔ لہذا میں یہ مضمون آپکے رسالے میں بھیجکر اُمید کرتا ہوں کہ آپ اسکو چھاپ دیں گے۔

اوّل یسوع کی حمایت سے عیسائیوں کا گریز

اپی فینی میں عصمتِ انبیاء پر جو خط وکتابت شائع ہوئی ہے اُس میں سب سے عجیب بات یہ ہے کہ عیسائی نامہ نگاروں نے ریویو آف ریلیجنز کے مضامین کے اُس حصہ پر توجہ کرنے سے قطعی طور پر گریز کیا ہے جسمیں انجیلی یسوع کی عصمت پر نکتہ چینی کیگئی تھی اُنہوں نے آپکے عصمتِ انبیاء کے مضمون کی تردید میں سارا زور لگایا ہوا ہے انبیاء کو گنہگار ثابت کرنیمیں ہر ایک کوشش سے کام لیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ اُنہوں اس امر کیلئے ذرا بھی کوشش نہیں کی کہ یسوع کو ان الزاموں سے بری ثابت کریں جو انجیل کے رُو سے اُسپر وارد ہوتے ہیں اُنکا اوّل فرض تو یسوع کی حمایت تھی مگر بجائے اس کے کہ اسکی حمایت میں کچھ کہیں اُنھوں نے دُوسرے انبیاء پر حملہ کرنے میں اپنی قوت توانائی خرچ کیا ہے۔ خود عیسائی نوشتوں کی بناء پر جو آپنے نکتہ چینی کی ہے اسپر اُنکو طیش آتا ہے اسکے لئے مخرج یہ اختیار کیا ہے کہ انبیاء کو جہانتک ممکن ہو بُرا کہا۔ ذنب کے معنوں پر تو اُنھوں نے بڑے پُر جوش مضامین لکھے ہیں مگر یسوع کی نکتہ چینیوں پر جو انجیل کی بناء پر کیگئی ہیں وہ خاموشی سے گذر گئے ہیں۔ اُنکی یہ عمداً خاموشی ظاہر کرتی ہے کہ وہ یسوع کی حمایت میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور اُنھوں نے اپنے خداوند کی حمایت میں کافی دلائل دینے کی بجائے یہی مناسب سمجھا ہے کہ اس امر میں بکلی خاموشی اختیار کی جاوے۔ اگر وہ درحقیقت یسوع کی حمایت کر سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ میدان میں نہیں آتے اور اُن اعتراضوں کا جواب نہیں دیتے جو یسوع پر اناجیل کی بناء پر کئے گئے ہیں۔

دوم - زبان عربی سے عیسائیوں کی جہالت کا ایک ثبوت

آپ نے لکھا تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی نسبت قرآن شریف میں جُرم کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا اسکے متعلق عیسائی نامہ نگاروں کیطرف سے یہ احمقانہ جواب دیا گیا ہے کہ انبیاء کی نسبت جُرم کا لفظ اسلئے استعمال نہیں کیا گیا کہ یہ لفظ قرآن شریف میں بالکل آتا ہی نہیں - اگر یہ بیہُودہ جواب صرف ہندوستان کی عیسائیوں کیطرف سے ہوتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ عربی زبان سے ان لوگوں کی ناواقفیت کس شخص کو معلوم نہیں بیشک ایسا بیہُودہ جواب اس مُلک کے عیسائیوں کے حال کے بالکل شایاں تھا - جو باوجود اپنی جہالت کے اپنے آپ کو عربی کا عالم ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نادانی سے عربی زبان کے باریک مسئلوں پر بحث کر کے اپنے آپکو ہنسی کا نشانہ بناتے ہیں - ہم اس مُلک کے پادریوں سے تو ایسے بیہودہ بیانات سُننے کے عادی ہی تھے مگر ہمیں یہ کبھی خیال نہیں گذرا تھا کہ دُوسرے اسلامی ممالک کے پادری بھی اپنے ہندوستانی بھائیوں کیطرح عربی سے محض نابلد ہیں - ہم خیال کرتے تھے کہ دوسرے اسلامی ممالک کے پادری اپنے ہندی بھائیوں کی نسبت عربی زیادہ جانتے ہونگے - مگر مصر کے ایک پادری مسٹر اوپسن نے ہمارے اس خیال کو غلط ثابت کیا ہے - اس شخص نے مصر میں بیٹھکر اس مباحثہ میں حصہ لیا ہے اور ناظرین یہ سُنکر تعجب کرینگے کہ یہی پہلے صاحب ہیں جنہوں نے یہ پیش کیا کہ جُرم کا لفظ قرآن شریف میں کسی شخص کے حق میں بھی استعمال نہیں ہُوا - چُونکہ یہ بات ایک مصر کے پادری کے مُنہ سے نکلی تھی اسلئے ہندستان کے پادریوں نے بڑے شوق سے اسکو لیلیا اور اس کی بڑی قدر کی - ہمیں تعجب آتا ہے کہ مسٹر اوپسن کو اس معاملہ میں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی کیا ہندوستان میں پہلے ہی عیسائی جہالت کافی موجُود نہ تھی - مسٹر اوپسن عربی سے ایسا ہی ناواقف معلُوم ہوتا ہے جیساکہ یہاں کے انگریز اکثر ہندستان کی بولیوں سے ناواقف ہوتے ہیں - اگر وہ عربی سے خُوب واقف ہوتا تو یہ بیہُودہ بات کبھی پیش نہ کرتا کہ قرآن شریف میں لفظ جُرم کا استعمال نہ نبی پر آیا ہے نہ غیر نبی پر - مگر اُسکے ہندوستانی بھائیوں نے اُسکے بیان کو خیر مقدم کہا صرف اسلئے کہ یہ بات مصر سے آئی ہے - انکو یہ خبر نہ تھی کہ اس امر میں وہ بھی انکی طرح نابینا ہے - اس امر میں راناگھاٹ کے ایک پادری مسٹر مازو نے جو حصّہ لیا ہے اُس سے نہایت ہی ہنسی آتی ہے - چُونکہ یہ شخص عربی سے ناواقف تھا اِسلئے اسکو اوپسن کے بیان کی لغویت نظر نہ آئی - جس طرح جاہل لوگ دُوسرے کی بات پر اعتبار کر لیا کرتے ہیں اسی سادگی سے اُس نے بھی مسٹر اوپسن کے بیان پر یقین کر لیا - اور

چاہا کہ اس نکتہ سے بڑا فائدہ اُٹھائے۔ اِس نے سمجھا کہ اب ریویو آف ریلیجنز کا ایڈیٹر خوب قابو میں آگیا ہے۔ کیونکہ وُہ عمداً ایک بڑی سخت غلط بیانی کا مرتکب ہوُا ہے۔ اس نے مناسب سمجھا کہ ایڈیٹر پر حملہ کرنے کے موقع کو ہاتھ سے جانے دے۔ اس بیچارے کو اپنی آنکھوں کا شہتیر نظر نہ آیا۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ مَیں مسٹر اوپسن کے لغو بیان کی تصدیق کرنے میں خود اپنی جہالت کا ثبوت دے رہا ہوُں۔ ہمیں اس سے تو تعجب نہیں آتا کہ وہ مسٹر اوپسن کی غلطی کو دیکھ نہ سکا کیونکہ اس سے اس بات کی اُمید ہی نہ تھی اسکی جہالت باوجود اپنی حماقت کے اسکو معذور ٹھیراتی ہے۔ اسکا جُرم تو یہ ہے کہ اُسنے شوخی سے ایڈیٹر پر کیوں حملہ کیا مگر میرے خیال میں اسکو اس امر کی کافی سزا مِلچکی ہے۔ اس کا حملہ ہی اس کے لئے کافی سزا ہے کیونکہ اس حملہ سے اُسنے اپنی پردہ دری کرائی اسکو اپنی جہالت اور مسٹر اوپسن کی بات پر حد سے زیادہ اعتبار کر لینے سے یہ ذلت نصیب ہوئی اور اُسے اس منحُوس وقت پر لعنت بھیجنی چاہئے۔ جبکہ اُسے اس مباحثہ میں حصہ لینے کا خیال آیا جس کے وہ بالکُل ناقابل تھا اور جو انجام کار اس کی پردہ دری کا باعث ہُوا۔ میں اسکو ہمدردی سے مشورہ دیتا ہُوں کہ آئندہ وُہ ایسے مباحثات میں شامل ہونیکا کبھی خیال بھی نہ کرے۔ جنمیں عربی دانی کی ضرورت ہو مَیں اُمید کرتا ہوں کہ وہ اس سبق سے فائدہ اُٹھائیگا اور پھر کبھی ایسے مباحثات میں دخل نہ دیگا اگر وُہ بیکار نہیں بیٹھ سکتا اور ضرور اُسکے لئے کوئی شغل چاہئے تو مَیں اُسکے لئے ایک اَور قسم کا مباحثہ تجویز کرتا ہُوں جسمیں اسکی ذات کے لئے کسی پردہ دری کا خطرہ نہیں۔ انجیل کی بناء پر ریویو آف ریلیجنز میں یسُوع پر نکتہ چینی کیگئی ہے۔ اور عیسائی نوشتوں کی شہادت پر یسُوع کی عصمت پر بڑے سخت اعتراض کئے گئے ہیں اسلئے مسٹر بازو کے لئے بہت بہتر ہوگا کہ اِس ضروری مسئلہ کو بحث کے نیچے لائے اور اس مضمون پر پُر زور مضامین لکھے۔ یہ اسکے لئے زیادہ سلامتی کی راہ ہے کیونکہ اسمیں اُسکے لئے کسی اپنی پردہ دری کا خطرہ نہیں۔ اگرچہ ممکن ہے کہ اِس سے اُس شخص کی پردہ دری ہو جائے جسکو جہالت سے وہ اپنا خُدا سمجھ کے پُوجتا ہے۔

مگر باوجود اسکے کہ یہ مسٹر بازو کے لئے نہایت ہی مقدس اور اعلےٰ درجہ کا فرض ہے کہ اپنے خُدا کی خُدائی کو اسکی معصومیت ثابت کر کے تھامے۔ مَیں وثوق سے کہتا ہوں کہ وہ اس کام کے لئے کبھی جرأت نہیں کریگا۔ اسکے اپی فینی میں بہت دفعہ خطوط چھپے ہیں جسمیں اُسنے ریویو آف ریلیجنز کے بعض بیانات پر اعتراض کیا ہے۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ باوجود اسقدر مذہبی جوش اور تعصب کے یسُوع کی عصمت پر جو اعتراض کئے گئے ہیں انکا کوئی دفعیہ نہیں کیا۔ وہ خُوب جانتا ہے کہ ایسی کوشش کرنا مفید نہیں

جُرم کی صُورت میں عیسائیوں کا جواب اس سے کچھ کم لغو نہیں ہے اگرچہ قریبًا تمام الفاظ جو جُرم کے لفظ سے نکل سکتے ہیں قرآن شریف میں آئے ہیں مگر وہ بیان کرتے ہیں کہ چونکہ جرم کا مادہ اپنی اصل صورت میں قرآن شریف میں کہیں نہیں آیا۔ اس لئے ریویو آف ریلیجنز کے ایڈیٹر نے بڑی غلط بیانی کی جبکہ اُس نے کہا کہ جُرم اگرچہ اکثر قرآن شریف میں دُوسرے لوگوں پر آیا ہے مگر انبیاء کی نسبت ایک دفعہ بھی نہیں آیا۔ گویا کہ ایڈیٹر صاحب کی یہ مُراد تھی کہ جُرم سے نکلے ہوئے لفظ ممکن ہے کہ انبیاء کی نسبت آئے ہوں مگر جُرم کا مادہ قرآن شریف میں انبیاء کی نسبت استعمال نہیں ہُوا۔

سوم۔ ذنب کے معنے

(ا) عیسائی بیان کرتے ہیں کہ قرآن شریف انبیاء کو ایسا ہی گنہگار ٹھیراتا ہے جیسا کہ معمولی آدمیوں کو۔ یہ صریحًا غلط ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو قرآن شریف ایسے الفاظ کو مثلاً جرم۔ فسق۔ جناح۔ اثم وغیرہ انبیاء کے متعلق کیوں استعمال نہیں کرتا۔ حالانکہ ایسے الفاظ اکثر دُوسرے لوگوں کی نسبت استعمال ہُوئے ہیں۔ اگر قرآن شریف اُنکو ایسا ہی گنہگار سمجھتا ہے جیسا کہ دُوسرے آدمیوں کو۔ تو کیوں وُہ اُنکے متعلق ایسے الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کرتا ہے جو دوسرے گنہگاروں کے متعلق اکثر استعمال کرتا ہے۔ لفظ فسق۔ جرم۔ اثم۔ جناح وغیرہ قرآن کریم میں قریبًا دو سو دفعہ آئے ہیں لیکن باوجود ان کی اسقدر کثرت استعمال کے کسی نبی کی نسبت وہ ایک دفعہ بھی استعمال نہیں کئے گئے۔ اگر لفظ ذنب اور جُرم وغیرہ میں کوئی فرق نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ قرآن شریف نے انبیاء کے لئے صرف ذنب کا لفظ چُن لیا ہے اور ہمیشہ جُرم وغیرہ الفاظ کے استعمال سے پرہیز کی ہے۔ اگرچہ قرآن شریف میں جرم۔ فسق۔ اثم وغیرہ کی نسبت ذنب کا استعمال بہت کم ہے لیکن باوجود اسکے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف دُوسرے لفظوں کو چھوڑ کر انبیاء کی نسبت صرف ذنب کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ قرآن شریف نے صریحًا انبیاء کے متعلق جُرم اور ذنب کے لفظ کے استعمال میں تمیز رکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کبھی انبیاء کی نسبت ذنب کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو وُہ جرم وغیرہ کا مُترادف نہیں ہوتا۔

(ب) ایک اور دلیل کہ ذنب ہمیشہ گُناہ سزا دشُدہ کے معنے نہیں رکھتا۔ یہ ہے کہ خُدا تعالےٰ ذنب کی ایسے فعل کے طور پر تعریف نہیں کرتا جو ہمیشہ قابل سزا ہو۔ حالانکہ دُوسرے الفاظ جرم۔ وغیرہ کی ایسی تعریف کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خُدا تعالےٰ ذنب کو تمام صورتوں میں قابل سزا فعل نہیں ٹھیراتا۔ ہمیں قرآن شریف میں کہیں نہیں بتلایا گیا کہ جس شخص میں صرف ذنب پایا جائے وہ ہمیشہ مستحق سزاء کا

بلکہ مضر ہو گا کیونکہ ان اعتراضات کی بناء اناجیل کے کھُلے کھُلے اور صریح الفاظ پر ہے۔

یہ آسانی سے سمجھ آسکتا ہے کہ عیسائیوں کو یہ غلطی کیونکر لگی کہ جُرم کا استعمال قرآن شریف میں ہُوا ہی نہیں۔ آپ نے جو مضمون عصمت انبیاء پر شائع کیا تھا اسمیں آپ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ قرآن شریف انبیاء کو گنہگار نہیں ٹھیراتا اور اس بات کے ثبوت میں آپ نے بیان کیا کہ قرآن شریف میں انبیاء کی نسبت جُرم کا لفظ جو گناہ کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ ہے کبھی نہیں آیا۔ اگرچہ یہ لفظ قرآن شریف میں دُوسرے لوگوں کی نسبت بہت دفعہ آیا ہے آپ کا یہ مطلب تھا کہ ایسے لفظ مثلاً مجرم۔ یجرمون۔ اجرموا۔ وغیرہ جو جُرم کے مادہ سے نکلے ہیں ممکن ہے کہ انبیاء کی نسبت استعمال کئے گئے ہوں مگر جرم اپنی مصدری صُورت میں انبیاء کی نسبت استعمال نہیں ہُوا۔ ایسا کہنا انبیاء کی عصمت کی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر دُوسرے لفظ جو جُرم کے مادے سے نکلے ہوئے ہیں انبیاء کی نسبت استعمال کئے جاتے اور صرف جُرم کی مصدری صورت استعمال نہ ہوتی تو یہ کوئی اُنکی عصمت کی دلیل نہ ہوتی۔ جُرم ایک جڑھ ہونیکی وجہ سے اِن تمام الفاظ پر حاوی ہے جو اس سے نکل سکتے ہیں۔ اور جب آپ نے کہا کہ جُرم کا استعمال انبیاء کے مُتعلق قرآن شریف میں نہیں آیا اگرچہ اکثر دُوسرے لوگوں کی نسبت آیا ہے تو صریحًا جُرم سے آپکی مراد وہ سارے الفاظ تھے جو اس لفظ سے نکلتے ہیں اور جنپر یہ لفظ حاوی ہے مگر عیسائیوں کو اتنا علم نہ تھا کہ وُہ اِس بات کو سمجھیں۔ اُنہوں نے کسی نجوم الفرآن میں لفظ جُرم کا دیکھا اور جب ان کو اس لفظ کا پتہ نہ ملا تو اُنہوں نے دلیری سے کہدیا کہ جُرم کا استعمال قرآن شریف میں ہُوا ہی نہیں۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس طرح وہ اپنی جہالت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ چونکہ عربی سے واقف تھے اُنکو یہ خیال نہ آیا کہ اُن الفاظ کو ڈھونڈھیں جو جُرم کے مادے سے نکلے ہوئے ہیں۔ اگر قرآن شریف میں دُوسرے الفاظ جو جُرم کے مادے سے نکلے ہُوئے ہیں انبیاء کی نسبت آئے ہوتے تو صرف نسئے کا نہ آنا ان کی معصومیت کو ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ فرض کرو کہ زید بیان کرتا ہے کہ گناہ کا لفظ یسُوع کی نسبت انجیل میں استعمال نہیں ہُوا اِسلئے اُسے معصوم سمجھنا چاہئے۔ مگر عمرو ایسے فقرے انجیل سے پیش کرتا ہے جنمیں یسوع کی نسبت یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ گنہ گار۔ گنہ کرنے والا۔ گناہ کُنندہ وغیرہ۔ تو کیا زید کے لئے یہ کُچھ عقلمندی ہو گی کہ اگرچہ یہ الفاظ یسُوع کی نسبت بیان کئے گئے ہیں۔ مگر چُونکہ لفظ گناہ اپنی سادہ اور غیر مرکب صُورت میں یسُوع کی نسبت نہیں آیا اِسلئے یسُوع کو بیگُناہ سمجھنا چاہئے۔ زید کا ایسا جواب موجب تمسخر ہو گا۔ لیکن لفظ

ہوتا ہے۔ مگر گناہ ایک قابل سزا فعل ہے۔ اور ہر ایک شخص جو گناہ کا مرتکب ہے سزا کا مستحق ہوتا ہے اس سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا تعالے ذنب کو تمام صورتوں میں گناہ کا مترادف نہیں قرار دیتا کیونکہ وہ کہیں بیان نہیں کرتا کہ جس شخص میں ذنب پایا جائے وہ ہمیشہ قابل سزا فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں ایک بھی آیت نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکل سکے کہ خدا تعالیٰ ذنب کی تمام صورتوں کو قابل سزا ٹھیراتا ہے بجائے اسکے کہ عیسائی قرآن شریف سے کوئی ایسی آیت پیش کرتے جس سے پایا جاتا کہ جس شخص میں ذنب پایا جائے وہ سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ایسی آیتیں پیش کی ہیں جنمیں ذنب گناہ کے لئے آیا ہے۔ گویا ہمارا یہ دعوےٰ تھا کہ ذنب گناہ کے معنوں میں آتا ہی نہیں۔ قرآن شریف سے ایسی آیتیں پیش کیگئیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجرم لوگ اپنے ذنوب کی سزا پائیں گے۔ لیکن کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس میں ذنب پایا جائے وہ سزا پائیگا۔ ان آیتوں سے تو اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جو مجرم ہونگے وہ اپنے ذنوب کی سزا پائیں گے۔ ہم عیسائی صاحبان سے ایسی آیت طلب کرتے ہیں جس کے یہ معنی ہوں کہ ہر ایک مذنب سزا پائیگا۔ قرآن شریف میں ایسی کئی آیتیں ہیں کہ جو کوئی جرم۔ فسق۔ اثم۔ کفر کرے وہ سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ آیت ہے۔ ومن یاتی ربہ مجرما فان لہ جہنم۔ ترجمہ۔ اور جو کوئی خدا کے پاس مجرم کے طور پر آئیگا دوزخ میں ڈالدیا جائیگا۔ لیکن ہمیں کہیں نہیں بتلایا گیا کہ جو کوئی رب کے پاس مذنب ہو کر جائیگا دوزخ میں سزا پاویگا۔ ایسا ہی قرآن شریف میں کئی آیتیں ہیں جنمیں فسق۔ اثم کفر وغیرہ تمام صورتوں میں قابل سزا فعل بیان کئے گئے ہیں۔ مگر ذنب کی کہیں ایسی تعریف نہیں کیگئی۔

مجرم۔ کافر۔ فاسق وغیرہ کا ذنب خالص ذنب نہیں ہے کیونکہ ان صورتوں میں ان لوگوں کیطرف صرف ذنب ہی منسوب نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان لوگوں کے ذنب کیساتھ جرم۔ کفر۔ فسق وغیرہ بھی ملائے گئے ہیں۔ اسلئے ہم نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ذنب جس کے ساتھ کفر۔ جرم۔ فسق وغیرہ نہ ملا ہوا ہو وہ بھی ہمیشہ قابل سزا ہوتا ہے۔ اگر مجرم کافر۔ فاسق وغیرہ کو اس کے ذنب کی سزا میں دوزخ کا وعید سنایا گیا ہے تو اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ انبیاء بھی جنکی طرف جرم۔ کفر۔ فسق منسوب نہیں کئے گئے۔ اپنے ذنب کے لئے مستحق سزا ہوتے ہیں۔ عیسائیوں کو قرآن شریف کی رو سے ثابت کرنا چاہیئے کہ جس شخص کیطرف صرف ذنب منسوب کیا گیا ہو۔ اور جرم۔ فسق۔ اثم وغیرہ اس کی طرف منسوب نہ کئے گئے ہوں وہ بھی سزا کا ایسا ہی مستحق ہو جاتا ہے جیسا کہ مجرم یا اثیم وغیرہ۔ اب قرآن شریف میں

خدا تعالیٰ انبیاء کی نسبت صرف ذنب کا لفظ استعمال کرتا ہے اور ذنب کو وہ کہیں ایسے فعل کے طور پر بیان نہیں کرتا جو کہ تمام صورتوں میں سزا کا مستحق بنا دے اور وہ جرم۔ فسق۔ اثم۔ کفر وغیرہ الفاظ انبیاء کی نسبت استعمال نہیں کرتا۔ اور وہ اُن فعلوں کو ان کی تمام صورتوں میں قابل سزا بیان کرتا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ انبیاء کو ایسے لوگوں میں شامل نہیں کرتا جو کہ سزا پانے کے خطرہ میں ہوتے ہیں جیسا کہ وہ دوسرے لوگوں کو سمجھتا ہے۔

(ج) عیسائی بیان کرتے ہیں کہ انبیاء بھی اسیطرح گناہ کر سکتے ہیں جیسا کہ دوسرے لوگ۔ اور یہ انبیاء اور دوسرے لوگوں میں اس بارہ میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن شریف اس کی تردید کرتا ہے وہ اس بارے میں انبیاء اور دوسرے لوگوں میں صاف تمیز کرتا ہے جب بعض لوگوں نے شک کیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت میں سے زیادہ حصہ لے لیا ہے تو خدا تعالےٰ نے انکے شبہات کا اس طرح جواب دیا ماکان لنبی ان یغل۔ (ترجمہ) نبی کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ مال غنیمت میں خیانت کرے جس طرح میں خدا وند تعالیٰ نے جواب دیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گناہ کے بارے میں خدا تعالےٰ انبیاء کو اور دوسرے لوگوں کو مساوات کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ خدا تعالےٰ انکے شبہوں کا یوں جواب دیسکتا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں کوئی خیانت نہیں کی۔ برخلاف اسکے خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نبی ایسا کام کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک انبیاء اور دوسرے لوگ گناہ کے معاملہ میں مساوی نہیں جیسا کہ عیسائیوں کا خیال ہے خدا یہاں ایک قسم کے گناہ کا ذکر اسلئے کرتا ہے کہ موجودہ صورت میں اسی قسم کا الزام لگایا گیا تھا اور یہی الزام تھا جس سے خدا تعالےٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بری کرنا چاہتا تھا۔

(د) عیسائی لوگ بیان کرتے ہیں کہ استغفار اپنے گناہوں کی معافی کے لئے ایک دعا ہے جو سرزد ہو چکے ہیں۔ اور جب تک کہ کوئی گناہ سرزد نہ ہو کوئی استغفار نہیں ہو سکتا۔ یہ بیان کئی وجوہات کے رو سے غلط ہے۔

(۱) استغفار کے لفظی معنے اس بیان کی تردید کرتے ہیں۔ اسکے معنے ہیں حفاظت مانگنا گناہوں سے حفاظت مانگنا دراصل دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک سرزد شدہ گناہوں کے بد نتائج سے حفاظت طلب کرنا۔ دوسرا خود گناہوں کے وقوع سے حفاظت طلب کرنا۔ ہم طبعی طور پر صرف یہی خواہش نہیں کرتے کہ ہمارے

گزشتہ گُناہ معاف ہوں بلکہ یہ بھی خواہش کرتے ہیں کہ آئندہ ہم سے گُناہ سرزد ہی نہ ہوں۔ اور استغفار ایک ایسی دُعا ہے جس میں ہم اپنی طبعی خواہشوں کو ظاہر کرتے ہیں اُس کو صرف ایک خواہش پر ہی محدُود کرنا بے انصافی ہے۔

(۲) قرآن شریف میں کئی آیات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ استغفار صرف سرزد شُدہ گُناہوں کے لئے ایک دُعا نہیں ہے بلکہ ہم بغیر کِسی گُناہ کے وقوع کے بھی استغفار کر سکتے ہیں۔ خُدا تعالیٰ ہمیں تاکید کرتا ہے کہ صُبح کے وقت استغفار کیا کرو۔ اگر استغفار ضرور گُناہوں کے بعد ہوتا ہے تو کیوں خُداوند تعالےٰ نے صُبح کا وقت خاص کیا۔ ہم سے جِس وقت گُناہ سرزد ہو اسی وقت استغفار کرنا چاہئے تھا۔ مگر خُدا ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم ہر روز صُبح کے وقت استغفار کیا کرو۔ وہ فرماتا ہے الصّابرین والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین بالاسحار پھر فرماتا ہے انّھم کانوا قبل ذٰلک محسنین کانوا قلیلاً مّن اللّیل ما یھجعون و بالاسحار ھم یستغفرون۔ ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیں یہی حُکم نہیں کرتا کہ جِس وقت تُم سے کوئی گُناہ سرزد ہو اُس وقت استغفار کیا کرو۔ بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ بغیر گُناہوں کے ارتکاب کے بھی ہم استغفار کیا کریں۔

(۳) ایک اور آیت جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ استغفار گنہگار ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے اسطرح پر ہے نُورُھُم یَسعیٰ بَینَ اَیدِیھِم وَ بِاَیمَانِھِم یَقُولُونَ رَبَّنَا اَتمِم لَنَا نُورَنَا وَاغفِر لَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیر۔ (سورۃ التحریم) اس آیت میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ بہشتی لوگ بھی استغفار کیا کرینگے۔ ان کا استغفار گُناہوں کے لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ بہشت میں کوئی گُناہ نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ اپنی دُنیاوی زِندگی کے گُناہوں کے لئے استغفار کریں گے کیونکہ ہمیں اِس سے پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ بہشت میں داخل ہونے سے پہلے اُن کے گُناہ معاف کئے جائیں گے۔ آیت اِس طرح ہے عسیٰ ربّکم ان یکفّر عنکم سیّئاتکم و یدخلکم جنّٰتٍ تجری من تحتھا الانھار۔ پس اُن کا استغفار گزشتہ گناہوں کے لئے نہیں خُود اِس آیت سے ہمیں پتہ مِلتا ہے کہ اُن کا استغفار کِس غرض کے لئے ہوگا۔ چُونکہ خُداوند تعالےٰ کے نُور کی کوئی حد نہیں ہے اِس لئے جو نُور اہل جنّت کو ملیگا وہ انکو اس نُور کے مقابل میں ناقص نظر آئیگا جو ابھی ان کو نہیں مِلا۔ اس نقص کو محسُوس کر کے وُہ خُدا سے دعا کرینگے کہ ہمارا نُور پُورا کر۔ اور ہماری اس

ناقص حالت کو ڈھانپ دے۔ مگر وہ کبھی نور سے سیر نہیں ہونگے۔ کیونکہ خدا کے نور کی کوئی حد نہیں اسلئے وہ ہمیشہ زیادہ اور زیادہ نور مانگتے رہینگے۔ اس سے معلوم ہوا کہ استغفار روحانی ترقی کے لئے ایک دُعا ہے۔ چونکہ روحانی ترقی کی کوئی حد نہیں۔ اسلئے انبیاء علیہم السلام ہمیشہ دعاؤں میں لگے رہتے ہیں اور ہمیشہ زیادہ نور مانگتے رہتے ہیں وہ کبھی اپنی روحانی ترقی پر سیر نہیں ہوتے اسلئے ہمیشہ استغفار میں لگے رہتے ہیں کہ خدا انکی ناقص حالت کو ڈھانپے۔ اور پورا روشنی کا پیمانہ دے۔ اسیوجہ سے خدا تعالیٰ اپنے نبی کو فرماتا ہے قُلْ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا یعنی ہمیشہ علم کے لئے دُعا کرتا رہ۔ کیونکہ جیسا خدا ابجد ہے ایسا ہی اُسکا علم بھی بحد ہے۔ القصہ اہل جنت کا استغفار صاف طور پر ثابت کرتا ہے کہ استغفار اور گناہ لازم ملزوم نہیں ہیں اور یہ کہ ہمارا استغفار اسلئے بھی ہوسکتا ہے کہ خدا ہماری کمزوریوں کو ڈھانپے اور روحانی ترقی کیلئے طاقت دے۔ عیسائی بڑے ظالم ٹھہرینگے اگر وہ اب بھی اصرار کرینگے کہ استغفار ہمیشہ گزشتہ گناہوں کی معافی کے لئے ایک دُعا ہوتی ہے۔

(۴) ایک اور آیت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ استغفار ہمیشہ گزشتہ گناہوں کے لئے نہیں ہوتا وہ یہ ہے فسبح بحمد ربك واستغفرہ انہ کان توابا۔ اس آیت میں خداوند تعالےٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کی تاکید کرتا ہے۔ یہ آیت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تھوڑے ہی دن پہلے اُتری۔ اب اس آیت کے ساتھ یہ آیت ملاؤ۔ انا فتحنا لك فتحا مبينا ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر۔ یہ آیت فتح مکہ کے وقت اُتری اسلئے یہ آیت اوّل الذکر آیت سے بہت پہلے کی ہے عیسائی اس آیت کا اسطرح ترجمہ کرتے ہیں "ہمنے تجھے ایک صریح فتح دی تاکہ ہم تیرے پہلے اور پچھلے گناہ معاف کریں"*۔ یہ عیسائیوں کا ترجمہ ہے۔ اسلئے عیسائیوں کو ماننا چاہئے کہ خدا تعالےٰ نے فتح مکہ کے وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کُل اگلے پچھلے گناہ معاف کردئے تھے اب جب خداوند تعالےٰ

* یہ معنے بالصراحت غلط ہیں کیونکہ اس آیت کا ربط ہی بگڑ جاتا ہے۔ ایک فتح کو گناہ کی معافی سے کیا تعلق ہے گناہوں کی معافی فتح کا کوئی نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں لفظ ذنب سے وہ عیب مراد ہیں جو کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف منسوب کیا کرتے تھے کہ یہ شخص مفتری اور جھوٹا ہے۔ خدا تعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح دی۔ جو کہ آپکی صداقت کی علامت تھی۔ اور اسطرح خداوند تعالیٰ نے آنحضرت کو فتح دیکر ان تمام الزاموں کو دور کردیا جو کفار آنحضرت صلعم کیطرف منسوب کیا کرتے تھے۔ خدا تعالےٰ نے آپ کے سلسلہ کو پوری کامیابی دی۔ اور آپکے دشمنوں کو ہلاک کیا اور اسطرح آپ کی سچائی کی شہادت دی۔ ربط کلام ان معنوں کی تائید کرتا ہے۔

نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دئے تو پھر خداوند تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو کیوں استغفار کی تاکید کی۔ اگر ہم عیسائیوں کے ترجمہ کو بھی مان لیں تو ہمیں نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ جب خداوند تعالیٰ نے گناہ معاف کرنے کے بعد استغفار کی تاکید کی تو وہ استغفار گذشتہ سرزد شدہ گناہوں کے لئے نہیں تھا کیونکہ آپ کے گناہ تو سارے معاف ہو چکے تھے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ اول سارے گناہوں کو معاف کرے اور پھر بعد اسکے گناہوں کی معافی منگوائے۔ پس عیسائیوں کو ماننا چاہئے کہ یہاں واستغفرہ کے معنے یہ نہیں کہ گناہوں کے لئے معافی مانگ۔ بلکہ یہاں استغفار کے معنے خداوند تعالیٰ سے قوت طلب کرنا ہیں تاکہ وُہ روحانی منزل کے طے کرنے میں طاقت بخشے۔ سباق کلام بھی اس معنے کی تائید کرتا ہے۔ اس سورۃ میں (یعنی النصر) میں خداوند تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم کی کامل کامیابی کا ذکر کرتا ہے۔ اور آپ کے قرب موت کیطرف اشارہ کرتا ہے۔ اور تاکید کرتا ہے کہ زندگی کے باقی دنوں میں صرف دُعا میں لگ جاؤ۔

(۵) عیسائی بیان کرتے ہیں کہ استغفار نہیں ہو سکتا جب تک کہ گناہوں کا ارتکاب ہو اور یہ کہ جتنا زیادہ کوئی استغفار کرے اُتنا ہی زیادہ وہ گنہگار ہوتا ہے۔ اس خیال کی قرآن شریف تردید کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریبًا ایک دن میں سَو دفعہ استغفار کیا کرتے تھے۔ اور آپ ساری عُمر ایسا ہی کرتے رہے۔ اب عیسائیوں کے نزدیک یہ بار بار کا استغفار گناہوں کی زیادتی کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر قرآن شریف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت بڑے تعریف والے کلمے بیان کرتا ہے مثلاً انّک لعلیٰ خلق عظیم نیز یہ آیت قل انّ صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ ربّ العٰلمین۔ پھر خداوند تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سراج منیر فرماتا ہے۔ اب ان تمام آیتوں سے اس نتیجہ کی تردید ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بار بار کا استغفار کثرت گناہوں کی وجہ سے تھا اگر ایسا ہوتا تو خداوند تعالےٰ ایسے الفاظ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یاد نہ فرماتا جنکا اُوپر ذکر ہوا ہے۔

(۶) خداوند تعالیٰ مسلمانوں کو حکم کرتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے نمونہ پر چلیں اور آپ کے ہر قول اور فعل کی پیروی کریں چنانچہ فرماتا ہے۔ قد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ پھر فرماتا ہے اِن کنتم تحبّون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ۔ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال عیب سے خالی نہ تھے تو کیوں ہم پر واجب کیا کہ ہم آپ کے نمونہ پر چلیں جب خدا نے ابراہیم علیہ السلام کے نمونے پر چلنے کی تاکید فرمائی تو ساتھ ایک استثنا لگا دیا* مگر آنحضرتؐ کی صورت میں

* دیکھو آیت قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم .... الا قول ابراھیم لابیہ لاستغفرنّ لک (الممتحنہ) اور آیت وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الّا عن موعدۃ وعدھا ایّاہ فلمّا تبیّن لہٗ انّہٗ عدوٌّ للّٰہ تبرّأ منہ۔ ان ابراھیم لاوّاہ حلیم (توبہ ع ۱۴)

کوئی استثنا نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال غلطی سے پاک تھے۔

چہارم۔ کیا عیسائی قرآن شریف سے حضرت مسیح کی عصمت ثابت کر سکتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر استغفار اور گناہ لازم ملزوم ہیں تو اس سے ماننا پڑتا ہے کہ قرآن شریف کے رُو سے حضرت مسیح بھی بیگناہ نہیں ہیں۔

(الف) قرآن شریف میں ہے یستغفرون لمن فی الارض یعنی خدا کے فرشتے کُل اہل زمین کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ اب اگر استغفار کے لئے گُناہ کا ہونا ضروری ہے۔ تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ حضرت مسیح بھی بیگناہ نہ تھے کیونکہ وُہ بھی اہل زمین میں شامل ہیں جنکے لئے فرشتے استغفار کرتے ہیں۔

(ب) قرآن شریف ایک اور جگہ فرماتا ہے کہ فرشتوں کا استغفار خاصکر مومنوں کے لئے ہوتا ہے وہ آیت اس طرح ہے یستغفرون للذین امنوا۔ قرآن شریف کی رُو سے تمام لوگ دو اقسام میں منقسم ہیں ایک مومن دوسرے غیر مومن۔ اور حضرت مسیح مومنوں میں شامل ہیں اور اسلئے فرشتے اُن کے لئے بھی استغفار کرتے ہیں۔ پس اگر استغفار سے گناہ کا ہونا لازم ہوتا ہے تو پھر حضرت مسیح بیگُناہ نہیں ہو سکتے۔

(ج) قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام گزشتہ انبیاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے واذا اخذ اللہ میثاق النبیین لما اتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ الخ (آل عمران رکوع ۹)

مسٹر اے۔ ایم۔ اذ اخذ اللہ میثاق النبیین کا عجیب ترجمہ کرتا ہے۔ اس کا ترجمہ کرنے کیواسطے وہ قرآن شریف کی ایک اور آیت کیطرف رُخ کرتا ہے۔ یعنی ولقد اخذنا میثاق بنی اسرائیل الخ ان دونوں آیتوں کو ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ پچھلی آیت کا یہ معنے ہے کہ خدا نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ اور پہلی آیت اپنی ترکیب کے لحاظ سے بالکل پچھلی آیت کے مشابہ ہے۔ اسلئے اسکے معنے یُوں کرنے چاہئے کہ خُدا نے انبیاء سے عہد لیا۔ دونوں ترکیبیں بالکل مشابہ ہیں۔ اور اگر لقد اخذنا میثاق بنی اسرائیل کے یہ معنے ہیں کہ خُدا نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تو دوسری آیت کے یہ معنے ہونے چاہئے کہ خدا نے انبیأ سے عہد لیا۔ صرف ہم نے ایک آیت میں انبیاء کا لفظ رکھنا ہے۔ اور دُوسری آیت میں بنی اسرائیل کا لفظ۔ باقی حالتوں میں دونوں عبارتیں بالکل ایک ہی

ہیں لیکن بجائے اسکے کہ مسٹر اے ایم اذ اخذ اللہ میثاق النبیین کا اسی طرز سے ترجمہ کرے
جس طرح وہ دوسری عبارت کا ترجمہ کرتا ہے۔ وہ اذ اخذ اللہ میثاق النبیین کا بہت ہی
خلاف محاورہ ترجمہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسکے معنے یہ ہیں کہ خدا نے انبیاء کے بارے میں بنی اسرائیل
سے عہد لیا۔ بنی اسرائیل کا لفظ وہ اپنی طرف سے ملاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ میثاق بنی اسرائیل کے
یہ معنے کرتا ہے کہ بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ دوسری طرف میثاق النبیین کا یوں ترجمہ کرتا ہے کہ انبیا
کے بارے میں بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ دونوں عبارتیں بالکل مشابہ ہیں۔ اسلئے اگر میثاق بنی
اسرائیل کے یہ معنی ہیں کہ بنی اسرائیل سے عہد لیا تو میثاق النبیین کے یہ معنے ہونے چاہئیں کہ نبیوں سے عہد لیا۔

اسکا یہ اعتراض کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی نبی زندہ نہ تھا جو آپ پر ایمان لاتا
اور آپکی نصرت کرتا۔ لغو ہے۔ خدا نے یہ عہد ہر ایک نبی سے کیا جو آنحضرتؐ سے پہلے گذرا اور خدا کی
وحی انبیاء پر اترتی تھی نہ کہ عام لوگوں پر۔ لیکن انبیاء کا فرض تھا کہ خدا کا یہ حکم اپنی اپنی امتوں کو
پہنچاتے اور ان کو تاکید کرتے کہ جب موعود نبی ظاہر ہو تو اسپر ایمان لانا اور اسکی امداد کرنا مگر
وہ اس حکم کو نہیں پہنچا سکتے تھے جبتک وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لاتے جب انہوں نے
آنحضرتؐ کی آمد کی پیشگوئی کی تو لازم تھا کہ وہ خود بھی آپکی نبوت پر ایمان لاتے۔ اگر مسٹر اے ایم کا اعتراض
ہمپر پڑتا ہے تو وہ اسکے مضمون پر بھی ایسا ہی پڑتا ہے۔ اگر عہد بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا تو وہ
بنی اسرائیل کی کوئی خاص نسل ہوگی۔ اگر انبیاء آنحضرتؐ کے زمانے تک نہ زندہ رہ سکتے تھے۔ تو
بنی اسرائیل بھی زندہ نہ رہ سکتے تھے۔ وہ نسل اپنے نبی کے ساتھ ہی گذر گئی ہوگی تو پھر وہ کسطرح
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کو دیکھ سکتی تھی۔ اسلئے دونوں صورتوں میں جن لوگوں سے عہد کیا گیا وہ نہ تو
خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسلئے دونوں صورتوں میں خدا کے حکم کی
تعمیل کرنیوالے وہی لوگ ٹھیرتے ہیں جو آنحضرتؐ کی بعثت کیوقت موجود تھے۔ اور اپنے انبیاء کے
قائم مقام تھے۔ پس ہمیں صرف یہی دیکھنا چاہئے کہ عہد کن سے کیا گیا۔ آیت کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا
ہے کہ عہد انبیاء سے کیا گیا۔ خدا سے الہام پاکر انبیاء کا فرض تھا کہ خدا کے اس حکم کو اپنی امتوں تک پہنچاویں
اور انکو تاکید کریں کہ موعود نبی پر ایمان لانا اور اسکی مدد کرنا۔ لیکن وہ کس طرح اوروں کو تاکید کرسکتے تھے
جبتک کہ وہ خود پہلے آنحضرتؐ کی نبوت پر ایمان نہ لاتے۔ انبیاء کی نصرت تو یہی تھی کہ وہ اپنی اپنی

اُمتوں کو تاکید کر جاویں کہ موعود نبی پر ایمان لانا - اور اُسکی نصرت کرنا -

اب چونکہ حضرت مسیح بھی انہی انبیاء میں سے ہیں جنکا اس آیت میں ذکر ہے اسلئے ثابت ہوا کہ وہ بھی آنحضرتؐ کی نبوت پر ایمان لاتے تھے اور اسلئے مومنین میں شامل تھے - اب خدا تعالےٰ آنحضرتؐ کو فرماتا ہے استغفر لذنبك وللمؤمنين والمؤمنٰت - اب اگر استغفار کیلئے گناہ لازم ہے تو ثابت ہوا کہ حضرت مسیح بھی بیگناہ نہیں تھے کیونکہ آپ بھی بموجب بالا آیت کے مطابق مومنین میں شامل تھے جن کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کا حکم ہے -

پنجم - کیا یہودیوں کی نسبت جُرم کا لفظ قرآن شریف میں نہیں آیا ؟

عیسائی نامہ نگاروں نے بیان کیا ہے کہ اگر انبیاء کی نسبت جُرم کا لفظ نہیں آیا تو یہودیوں کی نسبت بھی نہیں آیا یہ ان کی جہالت کا دوسرا ثبوت ہے - یہودیوں کی نسبت کئی جگہ جُرم کا لفظ قرآن شریف میں آیا ہے نمونہ کیلئے صرف تین آیتیں لکھنی کافی ہونگی - ایک آیت یہ ہے - وعلى الذين هادوا حرمنا كل ذى ظفر - و من البقر والغنم حرمنا عليهم شحومهما الّا ما حملت ظهورها او الحوايا او ما اختلط بعظم - ذلك جزينٰهم ببغيهم وانا لصٰدقون - فان كذبوك فقل ربكم ذو رحمة واسعة ولا يرد باسه عن القوم المجرمين (الانعام رکوع ۱۸) اس آیت میں یہودیوں کا ذکر ہے - جنکی نسبت لفظ مجرمین آیا ہے دوسری آیت یہ ہے ولقد ارسلنا من قبلك رسلًا الى قومهم فجاؤهم بالبينٰت فانتقمنا من الذين اجرموا - وكان حقًا علينا نصر المؤمنين (الروم رکوع ۵) اس آیت میں گزشتہ انبیاء کے دُشمنوں کو مجرم بیان کیا ہے حضرت مسیح بھی انہیں نبیوں میں شامل ہیں اسلئے انکے دُشمن قرآن شریف کی رُو سے مجرم ٹھیرتے ہیں اب ہم عیسائی صاحبان سے پُوچھتے ہیں کہ آیا یہودی حضرت مسیح کے دُشمن تھے یا دوست - اگر وہ آپکے دوست تھے تو بیشک وہ مجرم نہیں ہیں لیکن اگر وہ آپکے دشمن تھے تو پھر قرآن شریف کی رُو سے وہ مجرم ٹھیرتے ہیں - تیسری آیت یہ ہے وكذلك جعلنا لكل نبى عدوًا من المجرمين (پارہ ۱۹ - رکوع ۱) اس آیت سے بھی انبیاء کے دشمن مجرمین کے لفظ سے پکارے گئے ہیں - اور اسلئے یہودی بھی مجرم ٹھیرتے ہیں - کیونکہ وہ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے جانی دُشمن تھے - اور آنحضرتؐ کے بھی دُشمن تھے -

عیسائی نامہ نگاروں کو اپنے اِس بیہودہ قول سے شرم کرنی چاہئے کہ قرآن شریف میں جُرم کا لفظ یہودیوں کی طرف منسوب نہیں کیا گیا - انکا یہ قول بھی ایسا ہی بیہودہ ہے جیسا کہ انکا پہلا قول - کہ جرم کا لفظ قرآن شریف میں آیا ہی نہیں

اس سے عیسائی نامہ نگاروں نے صرف اپنی کم علمی کا ہی ثبوت نہیں دیا بلکہ اپنی کم فہمی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ اگر قرآن بعض یہودیوں کی نسبت جرم کا لفظ نہ بھی آتا تو کیا پھر وہ انبیاء سے مساوی ٹھیر سکتے تھے۔ خدا ان کی نسبت انکی بدعملی اور بدی بیان کرتے ہوئے ہر ایک لفظ سے کام لیتا ہے جو خیال میں آ سکتا ہے۔ ان کو فاسق۔ ملعون۔ کافر۔ معتدین شیاطین ظالم۔ بندر۔ مغضوب علیہم وغیرہ بیان کرتا ہے۔ ان الفاظ کے مقابل اگر قرآن شریف یہودیوں کی نسبت جرم کا لفظ نہ بھی بیان کرتا تو کیا وہ انبیاء کی طرح بیگناہ ثابت ہو سکتے تھے جنکے متعلق ان الفاظ میں سے کوئی بھی استعمال نہیں ہوا۔

ششم۔ احادیث اور عصمتِ انبیاء

عیسائیوں کی کوشش کہ احادیث کے الفاظ کی بناء پر کوئی نتیجہ نکالیں عبث ہے۔ پہلے انہیں ثابت کرنا چاہئے کہ یہ ہو بہو وہی الفاظ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلے۔ اور پھر ان سے نتیجہ نکالنا چاہئے۔ وہ نتائج جو صرف احادیث کے الفاظ پر مبنی ہوں پختہ نہیں ہو سکتے کیونکہ بناء انکی پختہ نہیں۔ قرآن شریف کے الفاظ کی بناء پر ہم نتائج قائم کر سکتے ہیں مگر احادیث کے الفاظ پر کوئی نتیجہ قائم نہیں کر سکتے۔ احادیث میں جو دعائیں مذکور ہیں انسے عیسائی عدم عصمت کا نتیجہ نکالتے ہیں مگر وہ ان دوسری احادیث کیطرف توجہ نہیں کرتے جن سے عصمت ثابت ہوتی ہے۔ صرف دعاؤں کے الفاظ کی بناء پر نتیجہ نکالنا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ بیشتر اس کے کہ ہم ان الفاظ سے کوئی نتیجہ نکالیں ہمیں پہلے یقینی طور پر ثابت کرنا چاہئے کہ ہو بہو یہی الفاظ بلا کم و کاست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلے۔ احادیث میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں انسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت ثابت ہوتی ہے۔ اور کوئی بھی صحیح حدیث ایسی نہیں ملتی جس سے اسکے برخلاف نتیجہ نکال سکیں۔ ہم یہاں نمونہ کے طور پر ایک حدیث مسلم سے درج کرتا ہوں جس سے صاف طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت ثابت ہوتی ہے

وعن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما منکم من احد الا وقد وکل به قرینه من الجن وقرینه من الملٰئکة قالوا وایاك یارسول اللہ قال وایای ولکن اللہ اعانني علیه فاسلم فلا یامرني الا بخیر۔ ترجمہ۔ ابن مسعود روایت کرتا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ تم میں سے ایسا کوئی نہیں کہ جس کے ساتھ ایک جن اور ایک فرشتہ نہ ہو پھر لوگوں نے کہا یا رسول اللہ آپ کے ساتھ بھی ہیں فرمایا میرے ساتھ بھی ہیں لیکن اللہ نے مجھے اُسپر مدد دی ہے پس وہ مسلمان ہوگیا ہے اور مجھے سوائے بھلائی کے اور کسی چیز کا حکم نہیں دیتا۔

ہفتم - قرآن شریف میں کسی نبی کے گناہ کا ذکر نہیں ہے

میں یہاں اُن انبیاء کا ذکر کرتا ہوں جنکی نسبت عیسائی بیان کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں انکے گناہوں کا ذکر ہے اور دیکھتا ہوں کہ اُنکا یہ قول کہانتک صحیح ہے۔

حضرت آدمؑ کی نسبت تو خدا خود فرماتا ہے ولم نجد له عزما - یعنی آدم نے یہ کام ارادۃً نہیں کیا۔ اب گناہ تو ارادہ پر منحصر ہے۔ اگر ایک شخص زہر پی لے اور اُسکو علم ہو کہ یہ زہر ہے اور اسکا نتیجہ موت ہوگا۔ تو ایسی صورت میں وہ ایک گناہ کا مرتکب ہوتا ہے لیکن اگر وہ اسکو بغیر علم کے پی لے تو اگرچہ اسکو نتیجہ بھگتنا پڑیگا مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے گناہ کیا۔ یہی حال حضرت آدم علیہ السلام کا ہے۔ ہمیں بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حوا نے انکو یہ پھل دیا تھا۔ انکو یہ علم نہ تھا کہ یہ وہی ممنوع پھل ہے۔ انکا یہ کام بیشک خدا تعالیٰ کے حکم کے خلاف تھا۔ مگر اُنھوں نے اس حکم کو عمداً نہیں توڑا۔ اسلئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُنھوں نے گناہ کیا۔ اس پھل کے کھانیکا وہی نتیجہ نکلا جو زہر کھانے سے نکلتا ہے۔ کیونکہ قدرت اپنا کام کرنے سے نہیں رک سکتی مگر اسقدر میں کوئی گناہ نہیں تھا کیونکہ ارادہ نہیں تھا۔

حضرت آدمؑ کبھی شرک کے مرتکب نہیں ہوئے۔ شرک ایک ناقابلِ عفو گناہ ہے اور خدا کے پاک لوگ ایسا گناہ نہیں کرسکتے جس آیت کا عیسائی حوالہ دیتے ہیں اسمیں حضرت آدم کا نام نہیں ہے اسمیں صرف عام انسانوں کے میلان کا ذکر ہے جو شرک کیطرف اُنمیں پایا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو مُکا مارا تھا وہ ناجائز محل پر نہیں تھا۔ اُنھوں نے اپنی جماعت کے ایک آدمی کی ایک دشمن کے مقابل حمایت کی اور موت کا واقع اتفاقی تھا۔ انکا ارادہ قتل کا نہیں تھا۔ خدا تعالیٰ کوئی گناہ انکی طرف منسوب نہیں کرتا۔

حضرت ہارون علیہ السلام کو عیسائیوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ اُنھوں نے بُت پرستوں کی امداد کی اور اُسمیں شریک ہوئے۔ یہ خالص جھوٹ ہے۔ قرآن شریف سے ہمیں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری میں قوم کو گوسالہ پرستی سے روک نہ سکے اور یہ قصہ قرآن شریف میں نہیں ہے۔ اگر دوسرے لوگ بائیبل کی جھوٹی کہانیاں درج کردیں تو قرآن شریف ایسے افسانوں کا ذمہ وار نہیں ہے۔

حضرت مسیح نے کہا کہ میں یونس نبی کا نشان دکھاؤنگا۔ کیا اُن کا یہ مطلب تھا کہ میں بھی یونس کیطرح ایک گناہ کا ارتکاب کرونگا۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ جسکو حضرت مسیح یونسؑ کا معجزہ قرار دیتے ہیں۔ اسکو آجکل کے عیسائی گناہ یا گناہ کی سزا بیان کرتے ہیں۔

بالآخر کیا عیسائیوں کے لئے یہ مناسب نہیں کہ پہلے یسوع کو اُن گناہوں سے بری کرکے دکھائیں جنکا ذکر.

انجیل میں ہے۔ بجائے اس کے کہ دوسرے انبیاء کو گنہگار ثابت کرنے کی کوشش کریں۔

لاہور کے بشپ کی رائے ہندوستان کی اخلاقی حالت پر

لاہور کا بشپ ایسٹ اینڈ ویسٹ ایک نئے مشنری رسالے میں مضمون نویسی کرتا ہوا ہندوستان کی گری ہوئی اخلاقی حالت پر یوں رقمطراز ہے ''اصول زندگی میں ایمان کا بالکل معدوم ہونا۔ ایک نہایت ہی گری ہوئی اخلاقی حالت اور گناہ کے احساس کا بالکل جاتے رہنا۔ یہاں تک کہ انسان اسکے ارتکاب میں بالکل بیحیا ہو جائے اور سچی توبہ کے قابل ہی نہ رہے۔ سوائے اسکے کہ اس گناہ کی سزا سے بچنے کی بڑی خواہش ہو۔ یہ ہے ہندوستان کی حالت اور یہ ہیں اُسکے لوگوں کی زندگی میں قابل توجہ باتیں۔ اور جب یہ غور کیا جائے کہ یہ رذیل حالتیں صدیوں سے ان لوگوں کے خون میں رچ گئی ہیں اور انکی زندگی کو تباہ کر چکی ہیں تو آسانی سے سمجھ آسکتا ہے کہ پادریوں کی کوششیں کیوں اس جلدی اور اس کثرت سے بارآور نہیں ہوتیں جیسا کہ ہم چاہتے ہیں'' یہ گری ہوئی اخلاقی حالت جسکو بشپ صاحب پادریوں کی کوششوں کے آگے ایک روک سمجھتے ہیں ایک استثناء کی محتاج ہے کیونکہ بعض قوموں کے درمیان جیسے مثلاً چوہڑے یا چمار یا پاریا یا بعض دوسری نیچ ہندو قومیں پادری صاحبوں کی کوششیں بہت بارآور ہوئی ہیں جس سے لاہور کے بشپ صاحب کی منطق کی رُو سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ چوہڑوں اور چماروں کی اخلاقی حالت اور گناہ کا احساس مسلمانوں اور ہندوؤں سے بہت بڑھ کر ہے پس کم از کم بشپ صاحب کو یہ چاہئے تھا کہ ہندوستان کے باشندوں کی اخلاقی حالت پر حملہ کرتے وقت چوہڑوں اور چماروں کو مستثنےٰ کر دیتے پھر شاید اُن کی اس غلط بیانی سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو اتنا رنج بھی نہ ہوتا۔ جہاں تک مسلمانوں پر بشپ صاحب کا حملہ ہے ہمارا ارادہ ہے کہ کسی دوسرے نمبر میں اسپر مفصل بحث کریں اور بر پردہ پر جو نہایت ہی بیہودہ حملہ بشپ صاحب نے اپنی فضیلت کو ثابت کرنے کیلئے کیا ہے اُسکی بھی تردید کریں لیکن قبل ایسی بحث کے ہمارے بعض سوالات ہیں جنپر اُمید ہے بشپ صاحب جواب دیکر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ بشپ صاحب کہتے ہیں کہ ہندوستان میں گناہ کا احساس ہی نہیں رہا۔ لیکن ہم باادب بشپ صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ اُنکے نزدیک شرابخوری بھی گناہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا یہ سچ نہیں کہ شرابخوری عیسائی ممالک میں اسلامی ممالک سے بہت ہی بڑھکر رائج ہے؟ کیا شرابخوری نے عیسائی اقوام کو تباہ کیا ہے یا مسلمانوں کو؟ کیا عیسائی قومیں دوسرے

ممالک میں جا کر شراب خوری کو رائج کر رہی ہیں یا مسلمان؟ کیا شراب خوری ایک ایسی بدی نہیں جو تمام دُوسری بدیوں کی جڑھ ہے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ شراب خوری ہی ایک ایسی چیز ہے جو گناہ پر دلیر کرتی اور اسکے احساس کو کم کرتی ہے؟ کیا شراب خوری اندھوں کی طرح تمام تمدنی اور اخلاقی اصولوں کو توڑنے والا نہیں ہوتا؟ اور بالآخر کیا شراب خوری کی عام کثرت اور رواج نے عیسائی ممالک میں بدکرداری کے درخت کی پرورش سب سے زیادہ نہیں کی؟ ہم بشپ صاحب کے مُنہ سے ہی یہ فیصلہ بھی سُننا چاہتے ہیں کہ اُنکے نزدیک زنا بھی کوئی گناہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا یہ سچ نہیں کہ زنا اسلامی ممالک کے مقابلہ میں عیسائی ممالک میں بہت ہی بڑھ کر کثرت سے ہو رہا ہے۔ بشپ صاحب سے بڑے بڑے کلیسیا کے عُہدہ داروں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے اور بشپ صاحب کو ان نہایت ضروری سوالات کا جواب دیتے وقت اس بات کو کبھی نہیں بھُولنا چاہیئے۔ کہ شراب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو شہوات کو اُبھارتی اور حیوانی خواہشوں کو جوش دیتی ہو۔ اور پھر کیا بشپ صاحب کے نزدیک قماربازی بھی کوئی گناہ ہے؟ اور اگر ہے تو سب سے بڑھ کر کونسے ممالک میں یہ رائج ہے۔ لیکن اگر بشپ صاحب کی یہ رائے ہے کہ شراب خوری اور زنا اور قماربازی گناہ ہی نہیں تو ہم اُمید کرتے ہیں کہ وہ گناہ کی تعریف کر کے اس معاملہ پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ ہاں ایک صورت میں ان کا جواب ایسا ہو سکتا ہے کہ ہمیں خاموشی اختیار کرنی پڑے۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ شراب خوری زنا اور قماربازی دُوسرے لوگوں کے لئے گناہ ہیں لیکن عیسائیوں کیلئے کوئی گناہ نہیں کیونکہ مسیح کے خون نے اُنکے کسی گناہ کو گناہ رہنے ہی نہیں دیا۔ اس صورت میں ہم مجبُور ہونگے کہ اُنکے جواب میں اسی طرح خاموشی اختیار کریں جس طرح شاکت مت والوں کے اس اصول کے جواب میں ہمیں خاموش ہونا پڑتا ہے کہ اُنکے منتروں میں اس قدر بڑی طاقت ہے کہ ماں یا بہن سے زنا کو جائز کر دیتی ہے۔